

و لله المشرق والمغرب

اقبال

پیام مشرق

منظوم ترجمہ

مبصر مجاز

ناشر

اقبال اکیڈمی

حیدرآباد

اقبال پیام مشرق

جرمن شاعر گوئیٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں

منظوم ترجمہ

مضطر مجاز

ناشر

اقبال اکیڈمی

حیدرآباد

Payam - e - Mashriq (IQBAL)

Versified URDU Translation

By

MUZTAR MAJAZ

اشاعت : اول جولائی ۱۹۹۶ء
تعداد : ۱۰۰۰
کمپیوٹر کمپوزنگ : ممتاز جہاں بیگم
ترتیب و تشکیل : حمید خاں
مطبع : اسپید پرنٹس سعید آباد، حیدرآباد - ۵۹
فون نمبر 4063538
قیمت : ۱۴۰ روپے

(ملنے کے پتے)

- ۱۔ اقبال اکیڈمی، مدینہ مینشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد - ۱
- ۲۔ الکتاب بک سیلز گن فاونڈری، حیدرآباد - ۱
- ۳۔ سب رس کتاب گھر سوماجی گوڑہ، حیدرآباد - ۴
- ۴۔ حسامی بک ڈپو چارمینار حیدرآباد - ۲
- ۵۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی - بھنڈی بازار بمبئی
- ۶۔ شب خون کتاب گھر 313، رانی منڈی الہ آباد - ۳
- ۷۔ سیاست سیلز کاؤنٹر عابد روڈ، حیدرآباد - ۱
- ۸۔ ادارہ شگوفہ 31 - پیپلز کوآرٹرز، حیدرآباد - ۱
- ۹۔ مصنف 16-1-24/A7 سعید آباد، حیدرآباد - ۵۹

انتساب

عزیز از جاں

محمد یوسف الدین خاں

اور

یار خوش خصال

ڈاکٹر یوسف کمال

کے نام

.....

فہرست

صفحہ نمبر	نظم	شمار	صفحہ نمبر	نظم	شمار
۹۳	کتاب کا کیرا	۲۱	۳	انتساب	۱
۹۴	کبر و ناز	۲۲	۷	پیش لفظ	۲
۹۵	لالہ	۲۳	۱۰	عرض مرتجم	۳
۹۶	حکمت و شعر	۲۴	۱۳	دیباچہ	۴
۹۶	حقیقت	۲۵	۲۱	پیش کش	۵
۹۷	جگنو	۲۶		<u>لالہ طور</u>	
۹۹	حدی	۲۷	۲۹	(رباعیات)	۶
	(ساربان جاز کا گیت)			<u>افکار</u>	
۱۰۲	بارش کا پہلا قطرہ	۲۸	۷۳	پہلا پھول	۷
	خدا اور انسان کے	۲۹	۷۴	دعا	۸
۱۰۳	درمیان ایک مکالمہ		۷۴	بلال عید	۹
۱۰۴	ساقی نامہ	۳۰	۷۵	تسخیر فطرت	۱۰
۱۰۵	شاہین و ماہی	۳۱	۸۰	خوشبو	۱۱
۱۰۶	تہنائی	۳۲	۸۱	نوائے وقت	۱۲
۱۰۷	شبنم	۳۳	۸۲	حیات جاوید	۱۳
۱۰۹	جگنو	۳۴	۸۳	فصل بہار	۱۴
۱۱۰	عشق	۳۵	۸۶	افکار انجم	۱۵
۱۱۲	اگر جینا ہے خطروں سے بچ جا	۳۶	۸۷	زندگی	۱۶
۱۱۳	جہان عمل	۳۷	۸۸	علم اور عشق کے درمیان مکالمہ	۱۷
۱۱۴	زندگی	۳۸	۸۹	تاروں کا گیت	۱۸
۱۱۵	حکمت فرنگ	۳۹	۹۱	نسیم صبح	۱۹
۱۱۶	حور و شاعر	۴۰	۹۲	باز کی نصیحت اپنے بچے کو	۲۰

۱۷۶	فلسفہ و سیاست	۶۳	۱۱۷	تہذیب	۳۱
۱۷۶	صحبت رفتگان	۶۴	۱۱۸	زندگی و عمل	۳۲
۱۷۹	جلال و ہیگل	۶۵	۱۱۸	الملك للہ	۳۳
۱۷۹	نیشا	۶۶	۱۱۹	جوئے آب	۳۴
۱۸۰	حکیم آمن سٹامن	۶۷	۱۲۰	عالمگیر کا خط	۳۵
۱۸۱	باہرن	۶۸	۱۲۰	بہشت	۳۶
۱۸۲	نیشا	۶۹	۱۲۱	کشمیر	۳۷
۱۸۳	پٹوئی	۷۰	۱۲۱	عشق	۳۸
	فرانسیسی فلسفی آگسٹس کومت	۷۱	۱۲۲	بندگی	۳۹
	اور مزدور کے درمیان ایک			(عہدیت)	
۱۸۳	مکالمہ		۱۲۲	غلامی	۵۰
۱۸۵	ہیگل	۷۲	۱۲۳	چیتان شمشیر	۵۱
۱۸۵	جلال و گوئیٹے	۷۳	۱۲۳	جمہوریت	۵۲
۱۸۶	پیغام برگساں	۷۴	۱۲۴	فرنگستان میں مبلغ اسلام	۵۳
۱۸۶	مئے خانہ فرنگ	۷۵	۱۲۵	غنی کشمیری	۵۴
۱۸۷	موسو لینن و قیصر ولیم	۷۶	۱۲۶	مصطفیٰ کمال پاشا سے خطاب	۵۵
۱۸۸	حکما	۷۷	۱۲۷	طیارہ	۵۶
۱۸۹	شعرا	۷۸	۱۲۷	عشق	۵۷
۱۹۰	خرابات فرنگ	۷۹		مئے باقی	
۱۹۱	انگلستان خطاب	۸۰	۱۲۸	(غزلیات)	۵۸
۱۹۱	قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور	۸۱		نقش فرنگ	
۱۹۲	نوائے مزدور	۸۲	۱۲۹	پیام	۵۹
۱۹۳	متفرقات	۸۳	۱۳۰	آزادی بحر	۶۰
	(گہر ریزے)		۱۳۱	جمیعت الاقوام	۶۱
۱۹۷	اشارات	۸۴	۱۳۱	شوہن بار و نیشا	۶۲

کلام اقبال کے تراجم (ایک جائزہ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیائے ادب میں اجالا شعری و ادبی تخلیق کاری ہی سے پھیلتا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مختلف ممالک اور معاشروں کے درمیان فکری استحسان اور تہذیبی لین دین کے لئے ترجمے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ ترجمہ اور وہ بھی ادبی تخلیق کا ترجمہ کتنا ہی مشکل بلکہ بعض نقادوں کے مطابق ناممکن ہی ہے، بہر حال یہ ایک ایسی تہذیبی اور فکری ضرورت ہے کہ جس کے بغیر دنیائے فکر و ادب بوقلمونی اور رنگارنگی سے محروم ہو کر سپاٹ ہو جائے اور مختلف معاشروں کا تخلیقی ہمبندی ایک دوسرے سے نابلد رہ کر اجنبیت اور ISOLATION کا شکار ہو جائے۔ اس خصوص میں شاعر مشرق علامہ اقبال کا مجموعہ کلام "پیام مشرق" بہائے خود اس کی ایک روشن مثال ہے۔ یہ مجموعہ اقبال نے جرمنی کے شہرہ آفاق شاعر گوئٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں ترتیب دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گوئٹے نے "دیوان مغرب" فارسی کے مشہور شاعر حافظ سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ گوئٹے فارسی سے ناواقف تھا لیکن اس نے دیوان حافظ کا مطالعہ فان، ہیر کے جرمن ترجمے کے ذریعے کیا تھا اور اسی ترجمے سے وجدان حاصل کر کے اس نے "دیوان مغرب" تصنیف کیا۔ تراجم کے ذریعے وجدان حاصل کرنے کا یہ زنجیری سلسلہ حافظ کے جرمن ترجمے سے شروع ہو کر اقبال کے "پیام مشرق" سے ہوتا ہوا مضطر مجاز کے زیر نظر "پیام مشرق" کے اردو ترجمے تک صاف نظر آتا ہے۔

لہنے غیر معمولی بسوط فکر و فلسفہ اور چونکا دینے والے شاعرانہ اسلوب کی بنا پر اقبال نے اپنی زندگی ہی میں مترجمین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا چنانچہ ۱۹۲۰ء ہی میں خود اقبال کے استاد اے۔ آر نکسن نے "اسرار خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا جس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کے اب تک کوئی بارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اقبال کے انگریزی مترجمین میں نکسن کی حیثیت تو خضر راہ مہیسی ہے کیونکہ ان سے متاثر ہو کر اے۔ جے آر ہیری نے "جاوید نامہ" "زبور عجم" "لالہ طور" کے علاوہ "شکوہ اور جواب شکوہ" کا ترجمہ کیا۔ ایک انگریز مترجم جس نے اقبال کے منتخب کلام کا ترجمہ کیا وہ ہے کیرنن (KIERANAN) جو بعد میں فیض

احمد فیض کے مترجم کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوا۔ ان غیر ملکی مترجمین کے علاوہ اقبال کے ہندوستانی اور پاکستانی انگریزی مترجمین کی فہرست میں الطاف حسین، بشیر احمد ڈار، نیاز صوفی، عبدالرحمان طارق اور خوشونت سنگھ وغیرہ ہیں۔ جرمن مستشرق اور ماہر اقبال پروفیسر انامیری شیمیل نے اقبال کے "جاوید نامہ" اور "بال جبریل" کا ترجمہ جرمن اور ترکی زبان میں کیا۔ مشہور اطالوی اسکالر سیندر و بوسانی نے "گلشن راز جدید" اور "جاوید نامہ" کے علاوہ "پیام مشرق" "ضرب کلیم" اور "زبور عجم" کی منتخب منظومات کو اطالوی زبان میں منتقل کیا۔ ان کے علاوہ جن دوسری مغربی زبانوں میں اقبال کے تراجم ہو چکے ہیں ان میں فرانسیسی، چیک، سویڈش، روسی اور ترکی بھی شامل ہیں۔ یورپی زبانوں کے علاوہ ایشیا کی جن اہم زبانوں میں اقبال کے تراجم ہو چکے ہیں ان میں چینی، انڈونیشیائی، عربی اور فارسی شامل ہیں برصغیر کی جن مختلف زبانوں میں اقبال کے تراجم دستیاب ہیں ان میں پنجابی، پشتو، بنگالی، گجراتی، سندھی، کشمیری اور ہندی شامل ہیں اس طرح دنیا کی تقریباً ساٹھ زبانوں میں اقبال کے منظوم یا منثور تراجم ہو چکے ہیں۔

اردو زبان کے شعری سرمائے میں اقبال کی حیات فکر، فن اور شعور کا مطالعہ بھائے خود ایک علاحدہ شعبہ تحقیق کی صورت اختیار کر چکا ہے اس لئے اقبالیات کے میدان میں اقبال کے فارسی کلام کے اردو تراجم کی ضرورت، ہمیشہ سے ہی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ان کوششوں کا آغاز اقبال کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ چنانچہ شبیر علی سرخوش کا ترجمہ "پیام مشرق" (مخلص) بہ عنوان "پیام مشرق" ۱۹۲۳ء ہی میں شائع ہو چکا تھا۔ گذشتہ ستر سال کے عرصے میں شاعر مشرق کے کلام کے کم و بیش بیس اردو تراجم شائع ہو چکے ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

- (۱) جاوید نامہ: مترجمہ انعام اللہ خان ناصر (۱۹۶۶ء)، رفیق خاور (۱۹۷۶ء)، مضطر مجاز (۱۹۸۱ء)
- (۲) پیام مشرق: شبیر علی سرخوش، (۱۹۲۳ء)، عبدالرحمان طارق (۱۹۵۲ء)، فیض احمد فیض (منتخب منظومات) (۱۹۷۷ء)، عصمت جاوید (۱۹۹۱ء)، منثور، مضطر مجاز (۱۹۹۶ء) (زیر نظر)
- (۳) اسرار خودی: مجلس ایس۔ اے رحمان (۱۹۵۲ء)، عبدالرشید لاضل (۱۹۵۶ء)، عصمت جاوید (۱۹۹۱ء)

(۴) زبور عجم: جسٹس ایس۔ اے رحمان (۱۹۷۷ء)، عبدالرحمان طارق (۱۹۷۷ء)

(۵) پس چہ باید کرد: ظفر احمد صدیقی (۱۹۵۵ء)، مضطر مجاز (۱۹۷۵ء)، رفیق خاور (۱۹۷۷ء)

(۶) ارمغان حجاز: عبدالرحمان طارق (۱۹۵۰ء)، مضطر مجاز (۱۹۷۵ء)، منور لکھنوی (۱۹۷۸ء)

اقبال کے فارسی کلام کے اردو مترجموں کی اس بکشاں میں ہر مترجم ایک روشن ستارے کی طرح تقسیم اقبال کی روشنی بکھیر رہا ہے۔ مترجموں کی اس فہرست میں کچھ نامی گرامی شاعر بھی ہیں اور کچھ علم و فضل کے ایسے متوالے ہیں جنہوں نے اپنا سارا فکری سرمایہ اقبال کو گھسنے اور گھمانے میں کی سعی میں صرف کیا۔ مضطر مجاز بھی ان میں سے ایک ہیں جو خود ایک شیوا بیان شاعر ہونے کے

ساتھ ساتھ اس ہندوستانی تہذیب کے اقدار اور ETHOS کے وارث اور عارف ہیں جس کی ترویج و ترسیل سے اقبال کی ساری تخلیقی کاوشیں عبارت ہیں۔ ایک پختہ مشق شاعر ہونے کے ناطے مضطر زبان بیان اور اظہار کے مختلف اسالیب کو برتنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ اقبال کے اس تخلیقی کرب کو اپنے اظہار کی گرفت میں لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس کو شاعر مشرق نے اپنی غیر معمولی قادر انکلائی اور منفرد لفظیات اور محاکات کے ذریعے مخصوص اسلوب اظہار کا پیراہن عطا کیا تھا۔

مضطر مجاز مترجمین اقبال میں غالباً واحد مترجم ہیں جنہوں نے اقبال کے چار فارسی مجموعوں کا اردو میں مکمل منظوم ترجمہ کیا۔ اس کسیت کے ساتھ ساتھ کیفیت کے لحاظ سے بھی یہ ترجمے جہانے خود ایک تخلیقی شان رکھتے ہیں۔ ان تراجم کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ مترجم نے تخلیق کار کے فکر و فن کو کچھ اس قدر اپنے اندر جذب کر لیا ہے کہ بعض تراجم پر طبعزاد کلام کا گمان ہوتا ہے۔ مترجم کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ محقق کی حیثیت سے بھی انہوں نے حواشی اور اشارات کے ذیل میں خاصہ علمی مواد بھی مہیا کر دیا ہے جن میں تاریخی حوالے، قرآنی تلمیحات، مشرقی اور مغربی مفکروں اور علماء کے مختصر خاکے وغیرہ شامل ہیں۔

"پیام مشرق" اقبال کے فکری سفر میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ انا میری شمیمیل "پیام مشرق" کو اقبال کے فکری سفر میں ایک اہم سنگ میل گردانتی ہیں کہ اس زمانے میں (۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۳ء) اقبال کی فکر نے مغرب سے لہانی اثرات قبول کئے۔

اسید ہے کہ اپنی ادبی اور معنوی اہمیت کے پیش نظر "پیام مشرق" کا یہ اردو ترجمہ اقبال کے ان طالب علموں کے لئے ایک سوغات سے کم ثابت نہ ہو گا جو فارسی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر اس اہم فن پارے سے استفادہ کرنے سے اب تک محروم تھے۔

پروفیسر (ڈاکٹر) یوسف کمال

۲۹ / جولائی ۱۹۹۶ء

عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد۔

آندھرا پردیش

عرضِ مترجم

دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ترجمے کی حیثیت ثانوی اور ذیلی رہی ہے جب کہ یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ساری دنیا میں علم و حکمت کا فروغ ترجمے ہی کا مہمون منت ہے۔ قدمِ مصری ادیب ارار اسونب سے ارسطو تک اور سقراط سے سارتر تک کسی بھی عظیم فلسفی، شاعر، اور دانش ور سے صرف اور صرف ترجمے کی مدد ہی سے ہم متعارف ہو سکے ہیں۔ تخلیق تو ایک ایسا وجدانی عمل ہے جس سے فن کار چٹکی بجاتے گذر جاتا ہے خود اقبال نے ایک جگہ اسے درد زہ یا جنسی تحریک کے ٹینشن سے تعبیر کیا ہے چنانچہ تخلیقی عمل کی تکمیل کو انھوں نے تسکین کا باعث بھی بتایا ہے۔ لیکن مترجم کی مشکلات تو چند در چند ہیں اس کو اس شعور اور لاشعور کے درمیانی دھندلکے سے اپنے آپ کو شعوری طور پر گزارنا پڑتا ہے جس سے فن کار وجدانی سطح پر بہ آسانی گذر چکا ہوتا ہے یہی وہ دشوار گزار راہ ہے جہاں مترجم فن کار کے تخلیقی سفر کے اسود و اسیض (لاشعور و شعور) سے اپنے آپ کو گزارتا ہے تو وہیں بقول ایڈرا پونڈ خود اپنی زبان کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ ہوتا ہے ترجمے کے عمل کی ایسی بیچ در بیچ جکڑ بند یوں کے باعث دنیا کا کوئی مترجم اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا ترجمہ اکمل اور اصل کا نعم البدل ہے ترجمہ زیادہ سے زیادہ اصل فن پارے کی تفہیم و تحسین میں معاون ہو سکتا ہے اس کا نعم البدل نہیں۔ یہ محض ایک آئینہ ہے جس میں مترجم قاری کو فن پارے کے حسن اصلی کی جس قدر زیادہ جھلک دکھلا سکے اسی قدر وہ کامیاب ہے۔ ترجمے کا نعم البدل بننا اس لئے بھی ممکن نہیں کہ ہر زبان اپنا ایک پیچیدہ تشکیلی نظام رکھتی ہے جس میں اس کی قومی تاریخ کے زیر اثر مقررہ تہذیبی اقدار، سماجی تخصیصات، مخصوص استعاراتی اور تلمیحاتی نظام اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ اس کے پیش نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیگر زبانوں کے مقابل فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ سب سے زیادہ ممکن العمل ہے کیونکہ دونوں زبانوں کا تہذیبی، تلمیحاتی اور استعاراتی نظام بڑی حد تک مشترک ہے۔

اس ساری دراز نفسی کا یہ مطلب نہیں کہ راقم الحروف زیر نظر ترجمے میں اپنے عجزِ اظہار کے لئے کوئی اعتذار پیش کر رہا ہے۔ مقصود صرف اس قدر ہے کہ فارسی زبان کے اس عظیم شاعر کے اس عظیم فن پارے کے ترجمے کو اصل کا نعم البدل نہ سمجھا جائے۔ اس موقع پر مناسب ہو گا اگر ہم جیارج اسٹینر (George Steiner) کے یہ معروضات بھی پیش نظر رکھیں:

" There can be no exhaustive transfer from language A to language B, no meshing of nets so precise that there is:

- (i) identity of conceptual content.
- (ii) Unison of under tone &
- (iii) absolute symmetry of aural & visual associates.

اس لحاظ سے شاعری کا ترجمہ شاعری میں اور مشکل ہے خصوصاً اقبال جیسے عظیم شعرا کے یہاں نہ صرف صوتی محاکات بلکہ سمعی (aural) اور بصری (Visual) پیکر تراشی اتنی افراط سے پائی جاتی ہے کہ اس کو گرفت میں لینا آسان کام نہیں۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ ترجمے کا منظوم ہونا ہی کیا ضروری ہے اس کا جواب ہمیں خود اقبال کے یہاں ملتا ہے کہ

صد نالہ شب گیرے ، صد آہ شرریزے

صد صبح بلا خیزے ، یک شعر دل آویزے !

شعر کی تاثیر بہر حال اپنی جگہ مسلم ہے کہ

یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے !

ادبی اور شعری ترجمہ کی اولین شرط اس کا نہ صرف وفادار ہونا ہے بلکہ خوبصورت ہونا بھی ہے اور خوبصورتی اور وفاداری ایک ساتھ مشکل ہی سے جمع ہوتے ہیں بہر حال جہاں کہیں یہ آپ کو یکجا نظر آئیں آپ خط اندوز ہوں ورنہ مترجم کے حق میں دعا خیر فرمائیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں کوئی اور صاحب ہمت مترجم اس کام کو بہ احسن الوجوہ انجام دے جائے کہ

راہ مضمون تازہ بند نہیں

تا قیامت کھلا ہے باب سخن !

جہاں تک ترجمے کے ڈکشن کا تعلق ہے مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ حتی المقدور یہ کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ معیارات کا لحاظ کرتے سہل اور سہل لفظیات سے کام لیا جائے لیکن مشکل اقبال کے " بحر خیالات کے گہرے پانی " سے بھی ہے کہ ان کے لئے ہماری فلموں اور ٹی۔ وی سیریلوں والی زبان کچھ زیادہ موزوں اور مناسب نہیں بلکہ اس سے نہ صرف مطلب کے خبط ہو جانے بلکہ مضحکہ خیز ہو جانے کا بھی احتمال ہے چنانچہ اس میں فنی سے زیادہ علمی زبان کو اظہار مطالب کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ آسان فارسی کا مشکل اردو ترجمہ نظر آئے۔ لیکن بہر حال یہ ایک سنجیدہ فن پارہ ہے جس کی تحسین کے سلسلے میں قارئین سے بھی کسی نہ کسی حد تک محنت اور دماغ سوزی کی توقع رکھنا بیجا نہ ہو گا کیونکہ یہ بہر حال وہ شاعری نہیں جو دفع الوقتی اور ذہنی تفریح کے لئے پڑھی جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب جہاں اقبال کے فلسفیانہ خیالات بلکہ صوفیانہ اور روحانی تجار (لالہ طور و مئے باقی) سے مملو ہے وہیں اس میں سماجی، قومی اور بین الاقوامی مسائل و مصائب پر ان کا فکری، جذباتی اور احساساتی رد عمل (افکار اور نقش فرنگ) بھی محفوظ ہو گیا ہے اس طرح اس کتاب کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ اس میں دو سمندروں کا ملاپ نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ مرج البحرین یلتقین۔۔۔۔۔ جو اس قدر واضح انداز میں ان کی کسی دوسری تصنیف میں نہیں ملتا۔ مشرق و مغرب کے علم و حکمت کو کھنگالنے کے بعد جو ان کے دل میں درد و کرب کی لہریں اٹھیں ان کے ارتسامات اس کتاب میں ملیں گے۔ رہ گئی دینتے کے ”دیوان مغرب“ کے جواب والی بات اس پر خود اقبال نے اپنے دیباچے اور ”پیش کش“ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس میں کسی طرح کا کوئی اضافہ کرنا مجھ جیسے بیچ میرز و بیچ مداں کی بضاععت سے باہر ہے۔

میں عزیز دوست جناب ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈمی کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کی دلچسپی کے باعث اقبال اکیڈمی نے اس کتاب کی طباعت اور اشاعت کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ قبل ازیں میراجا وید نامہ کا منظوم ترجمہ بھی اکیڈمی شائع کر چکی ہے۔

میں اپنے عزیز دوست پروفیسر ڈاکٹر یوسف کمال کا بھی ممنون ہوں کہ جنہوں نے نہ صرف میری علمی کاوشوں اور شعری سفر میں، ہمیشہ میری ہمت بندھائی بلکہ یہی کتاب نہیں ہر کتاب کی طباعت اور اشاعت کے مختلف مراحل میں اپنے مفید مشوروں سے مجھے نوازا۔ دیرینہ رفیق شفیق محمد یوسف الدین خاں (حال مقیم لندن) کے شکرے کے لئے شاید مجھے الفاظ نہ ملیں کہ ان کا مخلصانہ تعاون مجھے نہ ملتا تو سہہ نہیں یہ کام اور کتنے سال یونہی پڑا رہتا

اس سلسلے میں میرا کچھ کہنا تحصیل حاصل ٹھہرے گا۔ بقول مولانا جامی سے

حق راز حق شناس نہ از حجت و قیاس

خورشید راجہ حاجت شمع است و مشعلہ

مضطر مجاز

16-1-24/A-7

سعید آباد

حیدرآباد 5000 59

۱۶ / جولائی ۱۹۹۶ء

دیباچہ

"پیام مشرق" کی تصنیف کا محرک "حکیم حیات" گوئٹے کا "مغربی دیوان" ہے جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر مائنا لکھتا ہے:

"یہ ایک گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے....."

اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد

روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا مستلاشی ہے۔"

گوئٹے کا یہ مجموعہ اشعار جو اس کی بہترین تصانیف سے ہے اور جس کو اس نے

خود "دیوان" کے نام سے موسوم کیا ہے کن اثرات کا نتیجہ تھا اور کن حالات میں لکھا گیا

؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختصر طور پر اس تحریک کا ذکر کیا

جائے جس کو المانوی ادبیات کی تاریخ میں "تحریک مشرقی" کے نام سے یاد کرتے ہیں

میرا قصد تھا کہ اس دیباچے میں تحریک مذکورہ پر کسی قدر تفصیل سے بحث کروں گا مگر

افسوس ہے کہ بہت سا مواد جو اس کے لیے ضروری تھا ہندوستان میں دستیاب نہ ہو سکا

پال ہورن، تاریخ ادبیات ایران کے مصنف نے اپنے ایک مضمون میں اس امر پر بحث

کی ہے کہ گوئٹے کس حد تک شعرائے فارس کا ممنون ہے۔ لیکن رسالہ ناروانڈ سوڈ کا وہ

نمبر جس میں مضمون مذکور شائع ہوا تھا نہ ہندوستان کے کسی کتب خانے سے مل سکا نہ

جرمنی سے۔ مجبوراً اس دیباچے کی تالیف میں کچھ تو گذشتہ مطالعہ کی یادداشت پر بھروسا

کرتا ہوں اور کچھ مسٹر چارلس ری می کے مختصر مگر نہایت مفید اور کارآمد رسالے پر جو

انہوں نے اس موضوع پر لکھا ہے۔

ابتدائے شباب ہی سے گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت مشرقی تخیلات کی طرف مائل

تھی۔ سڑاس برگ میں جہاں وہ قانون کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ اس کی ملاقات

جرمن لٹریچر کی مشہور اور قابل احترام شخصیت ہرڈر سے ہوئی جس کی صحبت کے اثرات

کو گوئٹے نے خود اپنے سوانح میں تسلیم کیا ہے۔ ہرڈر فارسی نہ جانتا تھا لیکن چونکہ اخلاقی

رنگ اس کی طبیعت پر غالب تھا اس لیے سعدی کی تصانیف سے اسے نہایت گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ "گلستاں" کے بعض حصوں کا اس نے جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ خواجہ حافظ کے رنگ سے اسے چنداں لگاؤ نہ تھا۔ اپنے معاصرین کو سعدی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتا ہے "حافظ کے رنگ میں ہم بہت کچھ نغمہ سرائی کر چکے۔ اس وقت سعدی کے تلمذ کی ضرورت ہے"۔ لیکن باوجود اس دلچسپی کے جو ہر ڈر کو مشرقی لٹریچر سے تھی اس کے اپنے اشعار اور دیگر تصانیف پر مشرقی لٹریچر کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا۔ علیٰ ہذا القیاس گوئے کا دوسرا معاشر شملر بھی جو مشرقی تحریک کے آغاز سے پہلے ہی مرچکا تھا مشرقی اثرات سے آزاد ہے گو اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اس کے ڈراما "توران دخت" کا پلاٹ مولانا نظامی کے افسانہ "دختر پادشاہ اقلیم چہارم (ہفت پیکر)" سے لیا گیا ہے۔ جس کا آغاز مولانا نے اس شعر سے کیا ہے

"گفت کز جملہ ولایتِ روس

بود شہرے بہ نیکیونی چو عدوس"

۱۸۱۲ء میں فان ہیمیر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمہ کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لیے گوئے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اسکے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا۔ جس نے آخر کار "مغربی دیوان" کی ایک پایدار اور مستقل صورت اختیار کر لی مگر فان ہیمیر کا ترجمہ گوئے کے لیے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب و غریب تخیلات کا ماخذ بھی تھا۔ بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوت تخیل کسی خاص مصرع کے اثر سے ایک نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔ گوئے کا مشہور سوانح نگار ہیل سوٹسکی لکھتا ہے:

”بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش و حرارت، وہی وسعت مشرب، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی اغرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا شیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار ہے اسی طرح گوئے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہانِ معنی آباد ہے اسی طرح گوئے کے بیساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (یعنی حافظ نے تیمور (۱) کو اور گوئے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔“

خواجہ حافظ کے علاوہ گوئے اپنے تخیلات میں شیخ عطار، سعدی فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے۔ ایک آدھ جگہ ردیف و قافیہ کی قید سے غزل بھی لکھی ہے۔ اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی (مثلاً ”گوہر اشعار“۔ ”تیر مژگان“۔ زلف گرہ گیر“) بے تکلف استعمال کرتا ہے بلکہ فارسیت کے جوش میں امرد پرستی کی طرف اشارات کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتا۔ دیوان کے مختلف حصوں کے نام بھی فارسی ہیں۔ مثلاً معنی نامہ۔ ساقی نامہ۔ عشق نامہ۔ تیمور نامہ۔ حکمت نامہ وغیرہ۔ باوجود ان سب باتوں کے گوئے کسی فارسی شاعر کا مقلد نہیں اور اس کی شاعرانہ فطرت قطعاً آزاد ہے۔ مشرق کے لالہ زاروں میں اس کی نوا پیرائی محض عارضی ہے۔ وہ اپنی

(۱) خواجہ حافظ اور تیمور کی ملاقات کی روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ خواجہ کا انتقال تیموری فتح شیراز سے پہلے ہو چکا تھا۔

مغربیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا اور اس کی نگاہ صرف انھیں مشرقی حقائق پر پڑتی ہے، جن کو اس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے۔ عجمی تصوف سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی اور گو اسے یہ بات معلوم تھی کہ مشرق میں خواجہ حافظ کے اشعار کی تفسیر تصوف کے نقطہ نگاہ سے کی جاتی ہے، وہ خود تغزل محض کا دلدادہ تھا اور کلام حافظ کی صوفی تعبیر سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ مولانا روم کے فلسفیانہ حقائق و معارف اس کے نزدیک مبہم تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے رومی کے کلام پر غائر نگاہ نہیں ڈالی کیونکہ جو شخص سپونوزا (ہالینڈ کا ایک فلسفی جو مسئلہ وحدت الوجود کا قائل تھا) کا مداح ہو اور جس نے برون (اٹلی کا ایک وجودی فلسفی) کی حمایت میں قلم اٹھایا ہو اس سے ممکن نہیں کہ رومی کا معترف نہ ہو۔

غرض کہ "مغربی دیوان" کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعد کے شعرا پلائن۔ روکرٹ اور بوڈن سٹاٹ نے اس مشرقی تحریک کو جس کا آغاز گوئٹے کے دیوان سے ہوا، تکمیل تک پہنچایا۔ پلائن نے ادبی اغراض کے لیے فارسی زبان سیکھی۔ قافیہ ردیف بلکہ ایرانی عروض کے قواعد کی پابندی سے غزلیں لکھیں۔ رباعیاں لکھیں اور نپولین پر ایک قصیدہ بھی لکھا۔ گوئٹے کی طرح فارسی استعارات مثلاً "عروس گل"۔ "زلف مشکیں"۔ "لالہ عذار" کو یہ بھی بے تکلف استعمال کرتا ہے اور تغزل محض کا دلدادہ ہے۔ روکرٹ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت تینوں زبانوں کا ماہر تھا۔ اس کی نگاہ میں فلسفہ رومی کی بڑی وقعت تھی اور اس کی "غزلیات" زیادہ تر مولانا روم ہی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ چونکہ السنہ مشرقیہ کا عالم تھا اس لیے اس کی مشرقی نظم کے مواخذ بھی وسیع تر تھے۔ مخزن الاسرار نظامی۔ بہار ستان جامی۔ کلیات امیر خسرو۔ گلستان سعدی۔ مناقب العارفین۔ عیار دانش۔ منطق الطیر۔ ہفت قلزم وغیرہ جہاں جہاں سے حکمت کے موتی ملتے ہیں رول لیتا ہے۔ بلکہ اسلام سے پہلے کی ایرانی روایات و حکایات سے بھی اپنے کلام کو زینت دیتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے بعض واقعات بھی اس نے خوب نظم کیے ہیں۔ مثلاً محمود غزنوی کی موت۔ محمود کا حملہ سومنات۔ سلطانہ رضیہ وغیرہ۔ گوئٹے کے بعد مشرقی رنگ کا سب سے زیادہ مقبول شاعر بوڈن سٹاٹ ہے۔ جس نے اپنی نظموں کو مرزا شفیع کے فرضی نام سے

شائع کیا۔ یہ چھوٹا سا مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ۱۴۰ دفعہ شائع ہوا۔ اس شاعر نے عجمی روح کو اس خوبی سے جذب کیا ہے کہ جرمنی میں مرزا شفیع کے اشعار کو لوگ دیر تک فارسی نظم کا ترجمہ تصور کرتے رہے۔ بوڈن سٹاٹ نے امیر مغزی اور انوری سے بھی استفادہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں میں نے گوئٹے کے مشہور معاصر ہائیکا کا ذکر ارادہ نہیں کیا۔ اگرچہ اس کے مجموعہ اشعار موسوم بہ "اشعار تازہ" میں عجمی اثر نمایاں ہے اور محمود و فردوسی کے قصے کو بھی اس نے نہایت خوبی سے نظم کیا ہے تاہم بحیثیت مجموعی مشرقی تحریک سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس کی رائے میں گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے سوائے جرمن شعرا کا مشرقی کلام کوئی بڑی وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن عجمی جادو کی گرفت سے جرمنی کے اس آزاد رو شاعر کا دل بھی بچ نہ سکا۔ چنانچہ ایک مقام پر اپنے آپ کو عالم خیال میں ایک ایرانی شاعر تصور کرتے ہوئے جس کو جرمنی میں جلاوطن کر دیا گیا ہو لکھتا ہے:

"اے فردوسی! اے جامی! اے سعدی! تمہارا بھائی زندان غم میں اسیر
شیراز کے پھولوں کے لیے تڑپ رہا ہے۔"

کم درجے کے شعرا میں خواجہ حافظ کا مقلد ڈومر۔ ہرمن سٹال۔ لوشکے۔ سٹانگ لٹز۔ لنٹ ہولڈ اور فان شاک بھی قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر علمی دنیا میں اونچا پایہ رکھتا تھا۔ اس کی نظموں قصہ انصاف محمود غزنوی اور قصہ ہاروت و ماروت مشہور ہیں اور بحیثیت مجموعی اس کے کلام میں عمر خیام کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن مشرقی تحریک کی پوری تاریخ لکھنے اور جرمن اور ایرانی شعرا کا تفصیلی مقابلہ کر کے عجمی اثرات صحیح وسعت معلوم کرنے کے لیے ایک طویل مطالعہ کی ضرورت ہے جس کے لیے نہ وقت میر ہے نہ سامان۔ ممکن ہے کہ یہ مختصر سا خاکہ کسی نوجوان کے دل میں تحقیق و تدقیق کا جوش پیدا کر دے۔

"پیام مشرق" کے متعلق جو "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت

سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے، جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگسٹران کے تصانیف میں ملتا ہے۔ یورپ نے اپنے علمی اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں اور سائزینیٹی (سابق وزیر اعظم اطالیہ) سے "انحطاط فرنگ" کی دلخراش داستان بھی سن لی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے جو انسانی ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے۔ خالص ادبی اعتبار سے دیکھیں تو جنگ عظیم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشوونما کے لیے نامساعد ہے۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ اقوام کی طبائع پر وہ فرسودہ، سست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب نہ آجائے جو جذبات قلب کو افکار دماغ سے متمیز نہیں کر سکتی۔ البتہ امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ ملک قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات و افکار کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے۔

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام شرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اہل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی

کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔ اسی بنا پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرمانروائے افغانستان کے نام نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں اور افغانوں کی تربیت انہیں خاص طور پر مد نظر ہے۔ اس عظیم الشان کام میں خدا تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔

آخر میں میں اپنے دوست چودھری محمد حسین صاحب ایم۔ اے کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے "پیام مشرق" مسودات کو اشاعت کے لیے مرتب کیا۔ اگر وہ یہ زحمت گوارا نہ کرتے تو غالباً اس مجموعے کی اشاعت میں بہت تعویق ہوتی۔

اقبال

پیش کش

بہ حضورِ اعلیٰ حضرت امیرِ امان اللہ خان

فرماں روئے دولتِ مستقلہ افغانستان
خدا اللہ ملکہ و اجلالہ

نوجواں اور مثلِ پیراں پختہ کار
دل ترے سینے میں مثلِ جامِ جم
تیری مشکل سہل کر دے تیرا حزم
ملتِ صد پارہ کا شیرازہ بند
لعل و یاقوت اور الماسِ گراں !

اے امیرِ کامگار ، اے شہریار
آنکھ تیری محرمِ رازِ حرم
تیرے کہساروں سا محکم تیرا عزم
عزم ہے میرے تخیل سا بلند
تو نے سلطانوں سے پائے ارمغان^۱

اے امیر ، ابنِ امیر ، ابنِ امیر
بے نوا کا تحفہ بھی یہ کر پذیر^۲

پیکرِ خاکی کو گرمایا گیا
بخشتا ہوں عشق کا عہد شباب
وہ قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی

رمزِ ہستی مجھ کو سکھلایا گیا
لے کے آیا ہوں نوائے سنیہ تاب
ہیبرِ مغرب شاعرِ المانوی^۳

تھا وہ عاشقِ حسنِ شوخ و شگ کا
 ہے جواباً میرا یہ پیغامِ شرق
 میں نہیں خود ہیں، ہوں خود سے آشنا
 وہ جواں افرنگیوں سے، مثلِ برق
 وہ چمن زاد اور چمن پروردہ تھا !
 وہ چمن کا بلبل اور فردوسِ گوش
 دونوں دانائے ضمیرِ کائنات
 دونوں گوہرِ ارجمند اور تاب دار
 وہ تہہ قلزمِ تپاں شوخی سے تھا
 میں ابھی سیپی میں گرمِ تاب ہوں
 مجھ سے پیگانہ مرا ہر آشنا
 میں اسے دیتا ہوں شانِ خسروی
 اور وہ چاہے حدیثِ دلبری
 اس نے میرا سوزِ جاں دیکھا نہیں
 میری فطرتِ عشق سے ہم آہر ہوئی
 فاش ہیں مجھے پر رموزِ ملک و دیں
 گل کو بخشے رنگ یہ مضمون مرا
 شاعری کو مت سمجھ دیوانگی
 ہوں ہمز سے گرچہ میں سرمایہ دار
 گل نواؤں سے ہیں میری بے نصیب
 یہ فلکِ سفد بھی، دوں پرور بھی ہے
 آہ ! وہ جو صاحبِ جوہر بھی ہے

تو نے دیکھا اے شہ کیواں جناب آفتاب اپنا ہوا زیرِ حجاب
 اہلِ بطحا دشت میں گم ہو چکے سوزِ اللّٰہ کو بھی کھو چکے
 اور مصری غرقہ گردابِ نیل بچھ چکے تورانیانِ ژندہ پیل
 آلِ عثمان پر ہے ضربِ روزگار شرق و غرب ان کے لالہ زار
 عشق میں آئینِ سلمانی نہیں خاکِ ایراں ہے پہ ایرانی نہیں
 سوز و سازِ زندگی سے ہے تہی وہ پرانی آگِ دل میں بچھ گئی
 مسلم ہندی ہے بندہ پیٹ کا خود فروش اور دل سے دیں کو دھو چکا
 اس میں اب وہ شانِ محبوبی نہیں

خالدی ، فاروقی ، ایوبی نہیں

جھ کو فطرت نے دیا ہے قلبِ چاک ! دیں کے غم سے سنیہ تیرا چاک چاک
 تازہ کر آئینِ صدیق و عمر مثلِ بادِ صبح صحرا سے گزر
 قوم یہ پروردہ کوہ و دمن اس کی رگ میں خونِ شیراں موج زن
 ہے قوی اور زیرک اور روشن جبیں آنکھ بازوں کی طرح ہے تیز ہیں
 اس کی قسمت کا اسے ملتا نہیں اس کا وہ تارہ ابھی چمکا نہیں
 کوہساروں میں ہے وہ خلوت گزریں جدوجہدِ زندگی دیکھی نہیں
 محنتِ پیہم میں تیری جاں صبور زندہ کر تہذیبِ افغانِ غیور

تا کہ صدیقانِ امت میں رہے

دین کا سرمایہ قوت بنے

جہد ہے جینا کب استحقاق ہے صرف علمِ نفس و آفاق ہے
 حق نے حکمت کو کہا "خیر کثیر" جس جگہ تو خیر یہ دیکھے بگیر
 سید کل، صاحبِ اُمّ الکتاب جن کے دل پر سارے پردے بے حجاب
 گرچہ عین ذات وہ دیکھا کئیے "رب زدنی علماً" دہرایا کئیے
 علمِ اشیاء علمِ الاسما بھی ہے یہ عصا بھی ہے، ید بیضا بھی ہے
 سارے مغرب میں اسی سے روشنی چھاچھ سے بھی وہ بناتے ہیں دہی!
 لذتِ احساس سے خالی ہے جان خاکِ رہ کو رمزۃ الماس جان!
 علم و دولت ملتوں کا نظمِ کار علم و دولت ملتوں کا اعتبار
 علم کو لے سینہٴ احرار سے اور دولت سینہٴ کہسار سے
 چیر کر دیکھے اگر یہ کائنات ہے بھری دولت سے مثلِ سومنات

لعل ہیں تیرے بدخشاں میں بھرے

برقِ سینا تیرے کوہستاں میں ہے!

ہو حکومت گرتی محکمِ اساس چاہیے دیدہ اسے مردم شناس
 آہ! وہ آدم کہ ابلسی کرے آہ! وہ شیطان کہ ادریسی کرے
 رنگِ نیرنگ اس کا، بود اس کی نبود داغِ لالہ سا بھرا سینے میں دود^۲
 پاک باز اور اس کے پانے میں دغل^۳ ہے نفاق و مکر سے پُر ہر عمل
 کر نظر! اے خسرو صاحبِ نظر! سنگ جو چمکے، نہیں ہوتا گہر
 اس حکیمِ پاک زادِ روم نے سِرِّ مرگ و زندگی افشا کئیے

"امتیں اگلی تیرے کیسے ہوئیں

عود کو جندل^۴ سمجھتی رہ گئیں

(روم)

دین میں خدمت گری ہے سروری
 گو بہت ہیں کار ہائے ملک و دیں
 جو کمیں میں اپنی بیٹھے ، بالیقین
 شاہ بن کر ، صورتِ درویش جی ،
 قایدِ ملتِ شہنشاہِ مراد !
 شاہِ گردوں فریبی تھا درویش بھی
 گو زرہ میں غرق تھا وہ تابہ دوش
 وہ مسلمان جو کہ میری کر گئے
 شانِ فقر ان کی امیری میں رہی
 حکمراں تھے پر کوئی ساماں نہ تھا
 جس کا عشقِ مصطفیٰ ہو برگ و بر
 سوزِ صدیق و علیٰ کو حق سے مانگ
 عشق سے قائم ہے ملت کی حیات
 آپ کے جلوے ہی سے ظاہر ہوا
 روح انھیں کے عشق سے آرام پائے
 روز پر اس کے نہ آنے شام پائے

اٹھ کے لا گردش میں پھر وہ جامِ عشق
 دے کہتاں کو وہی پیغامِ عشق

لا اله الا الله
طوبى

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لالہ طور

(۱)

یہ عالم ہے شہیدِ نازِ اُس کا
 نیازِ اس کی تو فطرت میں ہے گویا
 یہ سورج جو چمکتا ہے فلک پر
 جبینِ صبح پر ہے داغِ سجدا

(۲)

ہے روشن دل مرا سوزِ دروں سے
 جہاں ہیں آنکھ میری اشکِ خوں سے
 وہ رمزِ زندگی سے نابلد ہے
 جو رشتہٴ عشق کا جوڑے جنوں سے

(۳)

چمن میں عشق لاتا ہے بہاریں
 کھائے گلِ دمن میں میلِ پرویں
 شعاعِ مہر اس کی چیرے قلزم
 وہی مہچھلی کو بخشے چشمِ رہ ہیں

(۴)

عقابوں کو وہ خاطر میں نہ لائے
 کبوتر کو وہ شاہیں سے لڑائے
 رہے دل لاکھ اپنا بچ کے لیکن
 کمیں سے عشق تیر اپنا چلائے

(۵)

رہین رنگ لالہ عشق سے ہے
 عجب اس کی بلا انگیزیاں ہیں
 اگر اس خاکداں کو چاک کر دیں
 تو دیکھو اس کی کیا خون ریزیاں ہیں

(۶)

بہنیں ملتی محبت ہر کسی کو
 نہ سب کو سازگار آتی ہے یہ شئے !
 رکھلے لالہ لیے داغِ جگر تاب
 دلِ لعل بدخشاں بے شرر ہے !

(۷)

پریشاں اس چمن میں مثلِ بو ہوں
 نہ جانے کیوں خراب جستجو ہوں
 برائے آرزو یا بر نہ آئے
 شہیدِ سوز و سازِ آرزو ہوں

(۸)

جہاں ہے مشیتِ گل، دل اس کا حاصل
 بھی اک قطرہٴ خون اس کی مشکل
 دو ہیں بچے یہ نگہ اپنی، وگر نہ
 جہاں ہر شخص کا بس اس کا ہے دل !

(۹)

کہا بلبل نے گل یہ منہ اندھیرے
 ہنناں غم سدا یاں اہلہائے
 بڑھاپے کو تو پہنچے خارِ صحرا
 جوانی ہی میں گل کیوں جاں سے جائے

(۱۰)

جہاں اپنا کہ ہے نابود اس کی بود ساری
 زیاں تو سود ہی کے ساتھ یاں پیدا ہوا ہے
 پرانے کو نیا کر دے، کوئی طرح دگر رکھ
 کہ دیر و زود سے اس کے دل اپنا بھر چکا ہے

(۱۱)

نوائے عشق کا ہے ساز آدم
 کہ کھولے راز ہے خود راز آدم
 جہاں کو وہ بنائے، یہ سجائے
 خدا کا جیسے ہے انباز آدم

(۱۲)

میں جو یا ابتدا نے انتہا کا
ہوں خود راز اور جہان راز ڈھونڈوں
اٹھے روئے حقیقت سے جو پردہ
تو اس بوک^۲ و مگر، کا راز پالوں

(۱۳)

دِلا ! نارائی^۳ پروانہ کب تک
گریز از شیوۂ مردانہ کب تک
کبھی خود آگ میں اپنی بھی جل جا !
طوافِ آتشِ بیگانہ کب تک

(۱۴)

اسی مٹی سے پیدا کر تن ایسا
ہو محکم تر فضائے تنگ سے جو
دل درد آشنا ایسا ہو اس میں
کسی کہسار میں جیسے ندی ہو !

(۱۵)

خدا نے آب و گل سے ایک خوش پیکر بنایا
جہاں باغِ ارم سے اور نہبا تر بنایا
مگر ساقی نے پھر اس آتش سوزاں سے اپنی
ہماری خاک سے اک عالم دیکر بنایا

(۱۶)

برہمن نے کہا محشر میں حق سے
کہ جینا تو فقط رقص شرر تھا
برا گر تو نہ مانے تو کہوں گا
صنم انساں سے بھی پائندہ تر تھا

(۱۷)

ہے کتنا تیز گام اے اخترِ صبح !
ہماری نیند سے شاید ہے مزار
ہوں میں گم کردہ رہ نا آگہی سے
تو بیدار آیا ہے جاتا ہے بیدار

(۱۸)

تہی مئے خانہ ہوتا ہائے وہو سے
شرر بیگانہ رہتی گل ہماری
نہ ہوتا عشق اور ہنگامہ عشق
خرد سا ہوتا فرزانہ جو دل بھی

(۱۹)

بنایا ہے تجھے اے تازہ پرواز
سراپا لذتِ بال آزمائی
ہوس نے دی گراں پرواز ہم کو
تجھے حاصل ہے ذوقِ پرکشائی

(۲۰)

خداوند! یہ لذت کیسی ہست و بود میں ہے
ہر اک ذرے کے دل میں ہے بپا جوش نمود اک!
کرے جب شاخِ گل کو چاک کوئی غنچہ گل
تجسم ہیز کر ڈالے اسے ذوقِ نمود اک

(۲۱)

سنا میں نے کہ پروانہ یہ کہتا تھا عدم میں
کہ پل بھر زندگانی کی مجھے بھی تاب و تب دے
سحر کے وقت کردے میری خاکستر پریشاں
مگر تھوڑا سا سوز و ساز مجھ کو ایک شب دے

(۲۲)

مسلمانو! مرے دل میں ہے ایسا حرفِ روشن
چمک جس کی سبھی آزر ہنادوں سے ہناں ہے!
مگر روشن سوا ہے جان جبریل امیں سے
کہ اسرارِ ابراہیمی کا وہ سر ہناں ہے!

(۲۳)

چلا پھر اس گلی میں، اے دل! اے دل!
مجھے یوں تھوڑ کر رکھا و تہنا
دامم آرزوئیں ہی جگائے
کوئی کام اور اب تجھ کو نہیں کیا

(۲۳)

کمند اپنی ستاروں پر تو پھینکی
 مثالِ دانہ خود پر بھی نظر کر
 تو اے نادان! خود سے آشنا ہو!
 درونِ خاک سے پیدا شجر کر!

(۲۵)

محر دم شاخسارِ بوستاں میں
 کہا کیا خوب مرغِ نغمہ خواں نے!
 سرود و نالہ ہو آہ و فغاں ہو
 اگل دے جو بھی ہے سینے میں تیرے!

(۲۶)

ادھر آ! نکتہٴ سر بستہ اک تجھ کو بتاؤں
 اگر لینا ہے مجھ سے تجھ کو درسِ زندگانی
 تہی ہے جاں سے تن تو موت ہے تیرا مقدر
 اگر جاں ہے تو حاصل ہے حیاتِ جاودانی

(۲۷)

حدیثِ سوز تو ہے سر بسر آزارِ گوش اس کی
 نہ چھیڑاے ہم نشیں! ہرگز نہ چھیڑا اب اس کا افسانہ
 جو خود ہو سخت کوش اور جان شعلہ نوش ہو جس کی
 وہی پروانہ ٹھہرے گا نظر میں میری پروانہ

(۲۸)

بنادے خود سے جو بیگانہ تجھ کو
 نہیں رکھتا میں وہ آبِ طربِ ناک
 مرے بازار میں مت ڈھونڈ کچھ اور
 مثالِ گل ہے بس اک سینیہ چاک !

(۲۹)

ملے گا کیا تجھے گلشن میں میرے
 شہیدِ رنگ و بو گر تو نہیں ہے
 رگِ گل میں ہے کیا ، آمیں بتادوں
 چمن یہ ، سحرِ رنگ و بو نہیں ہے !

(۳۰)

خودی تعمیر کر پیکر میں اپنے
 فزوں ہو اس جہانِ کیف و کم سے
 خلیل اللہ سا معمارِ حرم بن
 نکل کر ورطہٴ بود و عدم سے

(۳۱)

چمن کے طائرانِ خوش نوا سے
 میں ناواقف ہوں ، تہنا گا رہا ہوں
 تو نازک دل ہے ، تو مجھ سے حذر کر
 نوا سے میری ٹپ ٹپ ٹپ ہے خون

(۳۲)

عجب ہنگامہ ہے تیرے جہاں میں
 کہ ہیں سب ایک ہی پیمانے سے مست
 نگہ سے تو نگہ ملتی ہے سب کی
 پہ دل سے دل نہ جاں سے جاں ہے ہم دست

(۳۳)

سکندر نے کہا کیا خوب یہ نکتہ خضر سے کل
 کبھی تو بھی شریکِ سوز و سازِ بحر و بر ہو جا
 بڑی مدت سے تو اس جنگ کو تکتا ہے ساحل سے
 شریکِ جنگ ہو کر جان دے اور زندہ تر ہو جا

(۳۴)

سریہ کیقباد ، اکلیل جم خاک
 کلیسا و بتستان و حرم خاک
 نہیں معلوم ہم ہیں کون گوہر
 نگہ بر تر ہے گردوں سے ، تو ہم خاک

(۳۵)

تری مٹی میں گر رکھا گیا ہے
 دلِ صد پارہ و خوں نابہ باراک !
 تو سیکھ ابرِ بہاری سے بھی گریہ
 ترے اشکوں سے پھوٹے لالہ زار اک !

(۳۶)

بناتی ہے دمام نقش تازہ
 تڑپ ہی اک روش ہے زندگی کی
 اگر تصویر کل کی ہے ترا آج
 تہی ہے زندگی سے خاک تیری !

(۳۷)

جو ذوق نغمہ لائے سوئے جلوت
 قیامت ایک محفل میں اٹھادوں
 جہاں ہو جائے گم پھر میرے دل میں
 اگر دم بھر کو میں خلوت گزریں ہوں

(۳۸)

نہ پوچھو سینے میں دل چیز کیا ہے
 فرد میں سوز پیدا ہوتا ہے دل !
 تپش ہی دل کو دل گردانتی ہے
 تپش کو ہاتھ سے چھوڑے تو ہے گل

(۳۹)

فرد بولی : سما سکتا نہیں ہے وہ نگاہوں میں
 نگاہ شوق امید و بیم ہی میں ہے ہمیشہ سے
 پرانا ہو نہیں سکتا کبھی یہ طور کا قصہ
 کہ ہر دل میں ممتنائے کلمی خیر کرتی ہے

(۳۰)

کنشت و مسجد و بت خانہ و دیر
 کیا پیدا بھی انبارِ گل کا !
 یہاں اگتا ہے سب کچھ حکمِ دل سے
 کیا غافل ! نہ تو نے دل ہی پیدا !

(۳۱)

لگایا دل نہ اس بستانِ سرا سے
 کہ میں آزاد ہر اک بند سے تھا
 پھرا مثل نسیمِ صبح ہر سو
 گلوں کو دے کے آب و رنگ گزرا !

(۳۲)

ملا دیتی ہے اپنے آپ سے رنیدِ کہن کو
 جواں یہ مے جو میں ساغر میں بھرتا جا رہا ہوں
 کہ میں یہ مئے انھیں پیران مے خانہ کے مانند
 نگاہِ مست ساقی ہی سے لے کر آ رہا ہوں

(۳۳)

مرے جامِ سفالین کو مئے اس کی جامِ جم کر دے
 مرے قطرے میں اس نے اک سمندر ہی چھپا ڈالا
 بنایا تھا فرد نے میرے سر میں ایک بت خانہ
 خلیں عشق نے لیکن حرم اس میں بنا ڈالا

(۴۴)

ہاں پہ خرد تو پیرو امروز و دوش ہے
 سجدہ گزار ہر صنم چشم و گوش ہے
 ہیں اس کی آستین میں بت ہی چھپے ہوئے
 اولادِ برہمن ہے یہ زنتار پوش ہے

(۴۵)

خرد تو خیر ہر اک شخص کو بخش گئی ہے
 مرا یہ تن بھی اوروں کی طرح سے خاک و خون ہے
 مگر اس راز سے شاید اکیلا میں ہی واقف ہوں
 ضمیرِ خاک و خون میرا جو ہے وہ بے جگہوں ہے

(۴۶)

گدائے جلوہ پہنچا برسرِ طور
 نہیں ہے جان تیری خود سے محرم
 نکل جا جستجو میں آدمی کی
 خدا خود ہے یہاں جو یائے آدم !

(۴۷)

سنا ! جبریل کو میرا یہ پیغام
 کہ ہم نے پیکرِ نوری نہ پایا
 مگر ہم خاکوں کی تاب و تب دیکھ
 کہ نوری ، ذوقِ مہجوری نہ پایا

(۳۸)

ہمائے علم پھنس جائے گا تیرے جال کے اندر
یقین رکھتا ہے تو کم کر، اسیر بیم و شک ہو جا
عمل کا ہے اگر خواہاں تو پختہ کر یقین اپنا
تجسس ایک کا اور ایک ہیں بن کے یک ہو جا

(۳۹)

خرد نے تیرے چہرے کو حجابوں میں چھپا ڈالا
و لیکن تشنہ دیدار رکھتا ہوں نظر میں بھی
الٹھتا رہتا ہے اندیشہ بڑھ کر شوق سے اکثر
ہے آشوب افکنی کسی یہ جان زار میں میری !

(۵۰)

اجل کے خوف سے لرزے ترا دل
ہوا ہے زرد مانند زریری
خودی کو پختہ تر کر پختہ تر تھام
مرے گا پھر نہ بعد مرگ تو بھی !

(۵۱)

نہ پوچھ اس جان و تن سے میرا رشتہ
کہ میں اس دام میں ہرگز نہ آؤں
نوا جس طرح نکلے بانسری سے
دم آشفستہ ہوں اور مضطرب ہوں !

(۵۲)

کہا مجھ سے یہ پیرِ نکتہ داں نے
 ترے امروز کو فردا صدا دے !
 بچا خوبانِ بے پروا سے دل کو
 حریم اس کا ہے کر اس کے حوالے

(۵۳)

ضمیر اپنا دلیل اس کی ہر اک آیت پہ نکلے گا
 میاں ! رازی سے قرآن کے معانی پوچھتا کیا ہے
 خرد تو آگ بھڑکاتی ہے اور دل خود ہی سوزاں ہے
 بھلا تفسیرِ نمرود و خلیل اس کے سوا کیا ہے !

(۵۴)

کہوں میں کیا کہ بہتر ہے خموشی
 کہوں میں ہوں تو ٹھہرے خود پرستی
 و لیکن یہ نوائے سادہ کیا ہے ؟
 میں ہوں سینے میں یہ کہتا ہے کوئی !

(۵۵)

سنادو شاعرِ رنگیں بیاں کو میرا یہ پیغام
 اگر یوں مسلِ لالہ تو جلے تو فائدہ کیا ہے
 نہ اپنی آگ سے تو نے کبھی خود کو ہی پگھلایا
 نہ شامِ درد مندوں تجھ کو چمکانا ہی آیا ہے

(۵۶)

میں زشت و خوب سے تیرے ہنسی ہوں آشنا اصلا
بنایا تو نے اس سود و زیاں ہی کو عیار اپنا
ہنسی ہے مجھ سے تہنا تر کوئی اس بزمِ عالم میں
کہ میں نے دوسرے کی آنکھ سے دیکھی ہے یہ دنیا

(۵۷)

تو اے شیخِ حرم! شاید ہنسی اس بات سے واقف
جہانِ عشق کا بھی تو مقرر ایک محشر ہے
ہنسی جس میں گناہ و نامہ ہی کوئی نہ ہے میزاں
نہ مسلم ہی کوئی اس میں نہ اس میں کوئی کافر ہے!

(۵۸)

جو خود سے تاب و تاب لے قطرۂ آب
تو سو گوہر میں وہ یک دانہ ٹھہرے
تو اپنے ہم نواؤں میں جی ایسے
کہ گلشنِ تجھ کو خلوت خانہ ٹھہرے

(۵۹)

میں اے دانش ورو! ہر لحظہ تیج و تاب میں گم ہوں
خرد پر کھل ہنسی پایا کہ آخر ہے یہ قصہ کیا
نشیمن کس طرح اس خاک کے گھر میں کیا دل نے
یہ دل جو دشت ہے پیکِ غزالانِ خیالی کا!

(۶۰)

کنارے پر سجا محفل نہ اپنی، دیکھ یہ بھی
کنارے پر سبک رو ہے نوائے زندگانی
اتر جا سمنیہ دریا میں، موجوں سے لٹھ جا
ستیزہ کوشیوں میں ہے حیاتِ جاودانی

(۶۱)

سراپا معنی سربستہ ہوں میں
مجھے کیا حرفِ بانوں سے ہے لینا
مجھے مختار ہی کیسے نہ مجبوراً
سراپا انقلاب و خاکِ زندہ !

(۶۲)

نہ سمجھا مجھ کو، تو نے جو بھی سمجھا دعائے زندگانی
کہ تیری شیوہ ہائے زندگانی پر نظر یکسر نہیں ہے
مجھے ذوقِ سفر ہے اور میں ذوقِ سفر سے مست ہوں اتنا
کہ منزل میرے نزدیک ایک سنگِ راہ سے بڑھ کر نہیں ہے

(۶۳)

نظر پڑ جائے گرتیری کسی اک سنگِ سبزے پر
تری ہی آرزو کے فیض سے پھر وہ گہر ٹھہرے
نہ ناپ اے بندہ زر خود کو تو پیمانہ زر سے
کہ زر بھی تیرے اندازِ نظر کی چھب سے زر ٹھہرے

(۶۳)

نظر مضطر تھی ذوقِ جستجو سے
 وفا نا آشنا ، بیگانہ خو تھا
 تجھے دیکھا کہ سینے سے اڑا دل
 نہ جانا ، اس کا دست آموز تو تھا !

(۶۵)

ہے کیا عشق ، اور کیا نیرنگی عشق ،
 وہ ہر اک رنگ میں جلوہ دکھائے !
 نہیں سینے میں اک نقطے سے بڑھ کر
 ہے بے پایاں ، کبھی جو لب پہ آئے

(۶۶)

نہ ہو اے غنچہ نور ستہ دل گیر
 میر ہے چمن میں تو جو چاہے
 لب جو ، بزم گل ، مرغ چمن سیر
 صبا ، شبنم ، نسیم صبح گاہے !

(۶۷)

گلِ افسردہ مجھ سے کہہ رہا تھا
 نمود اپنی تو پروازِ شرر تھی
 بڑا ناپائیدار اس کا ہے ہر نقش
 دکھی ہے میرا دل ، محنت پر اس کی

(۶۸)

جہاں اپنا نہیں ہے جس کا پایاں
 ہے ماہی سا ، یم ایام میں غرق
 ذرا دل پر نظر کرتا کہ دیکھے
 یم ایام ہے اک جام میں غرق

(۶۹)

چمن زادوں کا میں ہم داستان ہوں
 زبانِ غنچہ ہائے بے زباں ہوں
 مروں میں جب ، صبا کے ساتھ اژادوں
 کہ میں شیدائیِ طوفِ گلاں ہوں

(۷۰)

نظر آتا تو ہوگا ، جو بھی ہے یہ وادیِ گل
 درونِ لالہءِ آتش بجاں کیا ماجرا ہے
 چمن تو ایک موج رنگ ہے اپنی نظر میں
 نہیں معلوم بلبل کی نگاہوں میں یہ کیا ہے

(۷۱)

تو سورج اور میں سیارہ تیرا
 کہ دمکادے مجھے نظارہ تیرا
 میں تجھ سے دور ا سو ہوں نامکمل
 تو قرآن اور میں سپارہ تیرا

(۷۲)

گزر اس کی درونِ دیدہ اچھی
 فزوں غم اس کا، جاں کا ہیدہ اچھی
 یہ نکتہ ایک صاحبِ دل نے کھولا
 کہ منزل سے رہِ پیچیدہ اچھی !

(۷۳)

میرا دماغ کافر زنار دار ہے
 بندہ بتانِ بندۂ پروردگار کا !
 گریاں ہے میرا دل تو سدا دردِ عشق سے
 آئین و دیں سے میرے سروکار تجھ کو کیا ؟

(۷۴)

صنوبر بندۂ آزاد اس کا
 فروغِ روئے گل ہے اس کی منے سے
 حریم اس کے ہیں مہروماہ و انجم
 دلِ آدم اسی کا بند در ہے

(۷۵)

جہاں کتنے تھے انجم تا بہ انجم !
 فردِ پُر کھولتی تھی، آسماں تھا
 مگر جب آپ پر میں نے نظر کی
 کرانِ بے کراں مجھ میں ہناں تھا !

(۷۶)

نہ ڈال اے دوست ! اپنے پانو میں زنجیرِ تقدیر
 کہ ہے اس گنبدِ گرداں کے نیچے راستہ بھی !
 اگر باور نہ آئے تجھ کو تو اٹھ اور خود دیکھ
 کہ جولاں گاہ ہے اک منتظر ہر گام تیری !

(۷۷)

مرا دل اپنے جادو کا گرفتار
 جہاں یہ اس کے پر تو سے ہے پر ضو !
 مرے صبح و مسا کیا جانے سورج
 مرے گزرے ہوئے پرسوں کا پر تو !

(۷۸)

یہ تیرا فیضِ زخمہ ہے ، نوازن جس سے میرا سازِ جاں بھی ہے
 پھر آخر کس طرح تو جاں میں بھی ہے اور جاں سے بھی ہے تو باہر ؟
 چراغ ایسا ہوں میں جلتا ہوں تیرے ساتھ ، بن تیرے نہ جل پاؤں
 مگر یہ تو بتا مجھ کو مرے بے چوں ! کہ بن میرے ہے تو کیوں کر ؟

(۷۹)

نفس یہ موجِ آشفۃ اسی کے بحر سے ہے
 یہ میری نے ، مرا نغمہ اسی کا فیضِ دم ہے
 لب جوئے ابد پر مثلِ سبزہ میں اگا ہوں
 رگ دریشے میں میرے جو بھی نم ہے اس کا نم ہے

(۸۰)

تجھے یہ درد یکتائی ساتا تھا
 کیا پیدا جہان رنگ و بو تونے !
 پچھے کیوں عشق سے میرے خطا امتنا
 کہ کیوں پیدا کی اتنی ہائے و ہو تونے ؟

(۸۱)

کسے تو ڈھونڈتا ہے ، کس لیے آخر یہ پیچ و تاب میں گم ہے ؟
 کہ وہ تو صاف عیاں ہے اور تو خود کو نقابوں ہی میں دیکھے گا
 تلاش اس کی کرے گرتو ، تو جز اپنے کسی کو بھی نہ تو دیکھے !
 تلاش اپنی کرے گا تو جز اس کے کسی کو بھی نہ پائے گا !

(۸۲)

تو ، اے کودک منش ! اپنا ادب کر
 مسلمان زادہ ہے ، ترکِ نسب کر
 عرب نازاں اگر ہے رنگ و خون پر
 تو اے مردِ خدا ! ترکِ عرب کر

(۸۳)

نہ افغانی نہ ایرانی نہ ہم ہیں ترک و تاتاری
 چمن زاد ، ایک ہی شاخِ چمن سے ہیں وابستہ
 تمیز رنگ و بو ممنوع ہے جائز ہنہیں ہم پر
 کہ ہم تو ایک ہی فصلِ بہاراں کے ہیں پروردہ

(۸۴)

ہناں ہے میرے سینے میں اک عالم
 ہے دل اس خاک میں اور دل میں غم ہے
 اسی صہبا سے جس سے جاں ہے سوزاں
 ابھی باقی سبو میں میرے غم ہے

(۸۵)

مرے دل! اے مرے دل! اے مرے دل!
 مرے یم، میرے کشتی، میرے ساحل!
 گرا مٹی پہ میری بن کے شبنم!
 کہ خود غنچہ کھلاتی ہے مری گل

(۸۶)

میں کیا بتلاؤں تجھ کو نیک کیا ہے اور بد کیا؟
 زباں بھی لڑکھڑاتی ہے کہ پیچیدہ ہے معنی!
 کھلے ہیں شاخ پر گل اور کلنٹے بھی ہیں لیکن
 درونِ شاخ دیکھو تو نہ کوئی گل نہ کانٹا!

(۸۷)

ہنہیں ہے جس کو حاصل دردِ پہناں
 وہ تن رکھتا ہے، پر رکھتا ہنہیں جاں
 اگر جاں کی ہوس ہے تو طلب کر
 وہ تاب و تب ہنہیں ہے جس کا پایاں

(۸۸)

نہ پوچھو کون ہوں ، آیا کہاں سے؟
 بہ خود پیچاں ہوں تو ہے زندگانی
 کہ اس دریا میں مثلِ موجِ مضطر
 بہ خود پیچاں نہ ہوں تو پھر ہوں فانی

(۸۹)

ہنیں رکھتا نگاہِ شوق کی تاب
 بہ صد جلوہ نقابوں میں چھپا ہے !
 رواں ہے خوں میں مثلِ مستی مئے
 مگر ہے دیر یاب اور کج ادا ہے !

(۹۰)

اٹھا منزل سے دل ، چل راہ اپنی
 نگہ کو پاک مثلِ مہر و مہ رکھ !
 متاعِ عقل و دیں اوروں کو دے دے
 ملے گر عشق کا غم تو نگہ رکھ !

(۹۱)

اے میرے رمزِ دل ! اے عشقِ ادھر آ !
 مری کھیتی ! مرے حاصلِ ادھر آ !
 پرانے ہو چکے سب پیکرِ خاک
 نیا آدم کوئی اب ڈھونڈ کر لا

(۹۲)

اگر دیتا ہے درد و غم سخن تو درد و غم اچھا !
 مجھے لگتے ہیں میرے نالہ ہائے دمبدم خوشتر
 سکندر کو خبر کیوں کر ہو میرے عیش و عشرت کی
 کہ ملکِ جم سے اے ہمدم ! نوائے دلکشا بہتر !

(۹۳)

سوارِ مرکبِ نختلی نہیں ہیں
 نہ میں وابستہ تخت و تاج سے ہوں
 یہ دولت مجھ کو اے ہمدم بہت ہے
 کہ سینہ کھود کر لعل اک نکالوں

(۹۴)

کمالِ زندگی چاہے تو پھر سیکھ
 خود اپنے آپ پر ، وا آنکھ کرنا
 بہالے جانا پانی کی طرح سب
 طلسمِ زیر و بالا توڑ دینا

(۹۵)

کے تو خاک کا پہلا ہے آدم
 اسیرِ عالمِ زشت و زیوں تر
 مگر اعجازِ فطرت نے رکھی ہے !
 بنائے بحرِ اسی کی آبجو پر - !

(۹۶)

دلِ بے باک ہے اک شیر گویا
دلِ ترساں کو آہو بھی ہے چیتا
ڈرے تو تو مگر ہر موج میں ہے
اگر بے خوف ہے تو بحر صحرا

(۹۷)

نہ جانے بادہ ہوں میں یا کہ ساغر
گہر دامن میں ہیں یا خود ہوں گوہر
بھی دیکھوں نظر ڈالوں جو دل پر
کہ میری جاں ہے دیگر، میں ہوں دیگر

(۹۸)

تو کہتا ہے کہ زیرِ دام ہے طائر ہمارا
پروبال اس کے اڑنا بھول بیٹھے ہیں سراسر
بدن سے بھی سوا برجستہ تر ہیں جاں کے معنی
نیام اپنی حقیقت میں ہے گویا سانِ کُسنجر

(۹۹)

ہمارے دل میں کیسے جنم لیتی ہے تمنا
چراغِ منزل اپنا کس طرح یہ جل رہا ہے
ہماری آنکھ کیسے دیکھتی، کیا دیکھتی ہے
ہماری گل میں کیسے دل چھپا بیٹھا ہوا ہے

(۱۰۰)

خراماں بعدِ مردن باغِ جنت میں ہوا جب
 لے تھے یہ زمین و آسماں آنکھوں میں میری
 عجب اک شک کا عالم مجھ پہ طاری تھا وہاں پر
 خداوند! جہاں تھا وہ کہ تصویرِ جہاں تھی !

(۱۰۱)

جہاں اپنا کہ جز! نگارہ کیا ہے
 کبھی ہے آج تو ہے یہ کبھی گل !
 کرے ہموار اسے سواں قضا کا
 کہ ہے یہ پیکرِ گلِ نامکمل !

(۱۰۲)

بھلا کس طرح تو اے آفتابِ آسماں گرد
 در آتا ہے مری آنکھوں میں اتنی دور رہ کر
 ہے واصل خاک سے اور خاکِ داں سے دور اتنا
 تو اے مڑگاں گسل! تیرا نشیمن ہے کہاں پر ؟

(۱۰۳)

بنائیشے سے اپنے راہ اپنی
 سزا ہے دوسروں کی رہ پہ چلنا
 ترے ہاتھوں سے ہو کر کارِ نادر
 اگر ہو پاپ بھی تو پن بنے گا !

(۱۰۳)

ہے مطلب دل کو منزل سے
 نہ آب و آتش و گل سے
 نہ کچھو تن میں سوتا ہے
 نہیں کام اس کو ساحل سے

(۱۰۵)

نظر بازی کبھی تو شاہدِ فطرت سے کرنا داں
 یونہی بیٹھا ہوا ہے گوشہء خلوت میں کیوں آخر
 خدائے لم یزل نے تجھ کو چشمِ پاک میں دی ہے
 اب اس کے نور سے اس کے لیے پیدا نظر بھی کرا

(۱۰۶)

اس آب و گل میں میں خلوت گزریں ہوں
 نہ افلاطون نہ فارابی کو جانوں
 کسی کی آنکھ کا جو یا نہیں میں
 خود اپنی آنکھ سے سب دیکھتا ہوں

(۱۰۷)

خبر کس کو ہے آغازِ خودی کی
 خودی کو حلقہء شام و سحر کیا
 خضر سے نکتہء نادر سنا یہ !
 نہیں ہے موج سے دیرینہ دریا

(۱۰۸)

مرے دل سیکھ لے غنچے سے رمزِ زندگانی
حقیقت اس کے ظاہر میں نمایاں ہو رہی ہے
کہ خاکِ تیرہ سے باہر نکلتا ہے و لیکن
نظر اس کی شعاعِ آفتابی پر جمی ہے

(۱۰۹)

یہ بزمِ باغِ وراغ اس کے ہی جلووں سے ہے روشن
یہ گلِ روشن ایسا، اس کی ہی مے سے ہو رہا ہے
نہ ہوگی شب کسی کی تیرہ و تار اس جہاں میں
کہ ہر دل میں اسی کے داغ کا دھپک جلا ہے

(۱۱۰)

چمن کی خاک سے اک غنچہ پھوٹا
پھر اس کی آنکھ سے نیند اس نے دھوئی
خودی ظاہر ہوئی پھر بے خودی سے
جہاں پایا وہ جس کی جستجو تھی !

(۱۱۱)

جہاں کو تھی نہ خود پر دست گہر کوئی
تو کوئے آرزو میں راہ اک ڈھونڈھی
پھر آغوشِ عدم سے اک ذرا نکلا
نکل کر قلبِ آدم میں سپنے لے لی !

(۱۱۲)

مرا دل راز دان جسم و جاں ہے
 نہ کبھو موت کچھ مجھ پر گراں ہے
 نظر سے اک جہاں کھویا تو کیا غم
 ہنوز اس دل میں میرے صد جہاں ہے

(۱۱۳)

گل رعنا ہے مشکل میں مری طرح
 گرفتارِ طلسمِ انجمن ہے
 ہنیں گویا زبانِ برگ اس کی
 مگر سینے میں اک دل خیمہ زن ہے

(۱۱۴)

مزاجِ لاءِ خود رو بگھتا ہوں
 درونِ شاخ بو سے آشنا ہوں
 تبھی مرغِ چمن ہے دوست میرا
 کہ اس کے گیت کے سُر جانتا ہوں

(۱۱۵)

جہاں اک نغمہ زارِ آرزو ہے
 ہم و زیر اس کا تارِ آرزو سے
 مری نظروں میں "تھا" ہے "اور" ہوگا
 فقط ہے روزگارِ آرزو سے

(۱۱۶)

مرا دل بے قرارِ آرزو ہے
 مرے سینے میں برپا ہائے و ہو ہے
 سخن کیا چاہتا ہے مجھ سے ہمدم !
 کہ میری خود تمھی سے گفتگو ہے !

(۱۱۷)

ہے سوزِ ناتمامی میں دوام اپنا
 تڑپنا مسلِ ماہی صرف کام اپنا
 کنارے سے حذر ! یعنی کنارے پر
 پچھا کر موت واں یہ ہنسی ہے دام اپنا

(۱۱۸)

برہمن سے خطا اتنا نہ ہو اے واعظِ شہر
 بتوں کے سامنے ہم سے اگر وہ سجدہ چاہے
 خدا نے بھی ہمارے کی تھی خود صورت گری اک
 کہا تھا سجدہ کرنے کو اسے پھر قدسیوں سے !

(۱۱۹)

حکیموں نے اگرچہ توڑ ڈالے کتنے پیکر
 مگر ہے سومناتِ ہست و بود ان کا مقدر
 کریں گے کس طرح افرشتہ ویزداں کو بس میں
 ابھی لٹراک میں ان کے ہنسی آدم برابر !

(۱۲۰)

جہاں اُگتے ہیں میری مشتِ گل سے
مرے حاصل سے لے سرمایہ اپنا
غلط سر کی ہے راہِ منزلِ دوست
مرے صحرائے دل میں ایک پل آ

(۱۲۱)

ہزاروں سال تھا ہمدوشِ فطرت
ہوا اس کا ، کیا خود سے کنارہ !
و لیکن سرگزشت اتنی ہے میری
تراشا ، کی پرستش ، توڑ ڈالا !

(۱۲۲)

میں پہنائے ازل میں پرکشا تھا
کہ بیگانہ تھا بندِ آب و گل سے !
بہا میری ہے اوپنچی تیرے نزدیک
کہ اس بازار میں تو مجھ کو لائے !

(۱۲۳)

ہناں اک جلوۂ افکار ، یہ کیا !
عمیاں اک عالمِ اسرار ، یہ کیا !
بتا تو ہی حکیمِ نکتہ پرداز
بدنِ آسودہ ، جاںِ سیار ، یہ کیا !

(۱۲۳)

مجھے بھی ناز ہے خود پر کہ میں بھی ہوں گدائے بے نیاز اک
تپاں ہوں اور فیض نے نوازی سے جلوں میں اور پکھلوں
بٹھا دیتا ہوں اپنے سوزِ نغمہ سے میں انکاروں میں تجھ کو
مری فطرت سکندر کی ہے ، میں آئینہ سازی میں لگا ہوں

(۱۲۵)

اگر تو ہو گیا آگاہ اپنے کیف سے ، کم سے
تو پھر تعمیر کر تو بحر اپنا اپنی شبنم سے
مرے دل ، آہ ! یہ در یوزگی مہتاب کی کب تک !
تو اپنی رات کو چمکا تو چمکا اپنے ہی دم سے !

(۱۲۶)

نہ کر تو غم کہ دل کی زندگی دم سے نہیں ہے
اسیرِ حلقہ بود و عدم بھی دل کہیں ہے
نہ ڈراے کم نظر ! پیکِ اجل سے تو کبھی بھی
گیا گردوم ، رہا باقی یہ دل ، تو غم نہیں ہے

(۱۲۷)

یہ دل ہے میرے پہلو میں ، تو بہتر
ہے تشریفِ شہاں سے میری گدڑی !
رہے گا بعدِ مردن بھی مرے ساتھ
مجھے اس دل سے امیدیں ہیں کتنی !

(۱۲۸)

سنا دو صوفیانِ باصفا کو
خدا جو بیانِ معنی آشنا کو
غلامِ ہمت اس کاہوں میں جس نے
خودی کے نور سے دیکھا خدا کو

(۱۲۹)

گزرمت اس چمن سے مثلِ زرگس یعنی بن دیکھے
مثالِ بو گزرمت غنچہ پچیدہ سے ہو کر
تجھے حق نے دیا ہے دیکھ تو اک دیدہ روشن تر
خرد بیدار ہو، خوابیدہ دل ہو، یوں گزرمت کر

(۱۳۰)

تراشے ہیں صنم اپنی ہی صورت پر
بنایا ہے خدا کا نقش بھی خود سا
ہے ناممکن نکلنا آپ سے باہر
بہر صورت خود اپنے آپ کو پوجا !

(۱۳۱)

کہا اک غنچہ نورستہ نے اک روز شبنم سے
کہ ہم اہل چمن کی تو نظر ہی نارسا سی ہے
ذرا یہ تو بتا مجھ کو، جہاں ہیں سینکڑوں سورج
انھیں پہنائیوں میں پست و بالا کا نشان بھی ہے ؟

(۱۳۲)

زمین کو آسماں کا رازداں جان
مکان کیا ، شرحِ رمزِ لا مکان ہے
اڑے ہر ذرہ سوئے منزلِ دوست
نشانِ راہ لے ریگِ رواں سے

(۱۳۳)

ضمیرِ کن فکاں کچھ ہے تو تو ہے !
نشانِ بے نشان کچھ ہے تو تو ہے !
قدم بے باک ترکھ زندگی میں
بہ پہنائے جہاں کچھ ہے تو تو ہے !

(۱۳۴)

ہمارے میکدے کی خاک ہے ورنہ زمیں کیا ہے
ہمارے ایک پیمانے کی گردش ہے فلک گویا !
ہے طولانی ہماری یہ حدیثِ سوز و سزاے دوست !
جہاں یہ ہے فسانے کا ہمارے ایک دیباچہ !

(۱۳۵)

سکندر چل دیا ساتھ اس کے شمشیر و علمِ رخصت
فراجِ شہرِ رخصت اور گنجِ کان و بزمِ رخصت
امم کو پادشاہوں سے سوا پائندہ تر جانو
کہ ایراں رہ گیا باقی ہوئے کاؤس و جمِ رخصت

(۱۳۶)

اڑایا دل کو سینہ چاک کر کے
 کیا غارت مرا گنجینہ سارا
 متاع آرزو میری کسے دی
 غم دیرینہ کا میرے کیا کیا

(۱۳۷)

نگاہوں سے جہانِ رنگ و بو گم
 زمین و آسمان و چار سو گم
 تری خلوت سے وہ رخصت ہوئے ہیں
 کہ خود اے دل ہوا سے ان سے تو گم

(۱۳۸)

بہنیں واقف کہ کیا ہے پردہ ساز
 پہ واقف ہوں نوائے زندگی سے
 ہوا یوں شاخساروں میں نواخواں
 کہ ہے یہ کون گل بلبلی سے پوچھے

(۱۳۹)

سر محفل ہوا نغمہ سرا میں
 شرارِ زندگی مٹی میں ڈالا
 ہوا نورِ خرد سے دل ضیا گیر
 خرد کو پھر عیارِ دل پہ رکھا

(۱۴۰)

عجم ہوا ہے جو اں میرے گیت سن سن کر
 متاع اس کی گراں ہے، وہ ہے مرا سودا
 بھٹکتا دشت میں گم کردہ رہ بجوم تھا اک
 مری درا سے وہی بن کے کارواں نکلا

(۱۴۱)

مری نے سے عجم آتش بہ جاں ہے
 صدا میری درائے کارواں ہے
 حدی خواں تیز تر ہوں مثلِ عرفی
 کہ رہ خوابیدہ اور محمل گراں ہے

(۱۴۲)

جو مجھ میں تھی وہ آتش میں نے بھڑکادی
 اٹھا کر سنیعہ مشرق میں دل رکھا
 بنی ہے اس کی مٹی شعلہ زارِ آخر
 کہ میں اس پر ہوں بجلی کی طرح ٹوٹا!

(۱۴۳)

مجھے مثلِ نسیم آوارہ کر ڈالا
 مرا دل مثلِ گلِ صد پارہ کر ڈالا
 نگہ کو میری جو ظاہر نہیں دیکھے
 شہیدِ لذتِ نظارہ کر ڈالا

(۱۳۳)

خرد کرپاس کو چاہے تو زرشینہ بناڈالے
 کمال اس کا تو پتھر کو بھی آئینہ بناڈالے
 نوائے شاعر جادو بیاں میں ہے اثر ایسا
 کہ نیشِ زندگانی کو وہ نوشینہ بناڈالے

(۱۳۵)

چکھا پھل میں نے شاخِ آرزو کا
 کہ رازِ زندگی میں جانتا ہوں
 ذرا ڈر باغبان سے ناوک انداز
 کہ پیغامِ بہاراں لا رہا ہوں

(۱۳۶)

تخیل میرا جو چنتا ہے گل ، گلزارِ جنت کے
 اسے جس وقت مضمونِ غریب اک سوجھ جاتا ہے
 لرزتا ہے مرادل سینے میں اس برگِ گل کی طرح
 کہ جس پر قطرہٴ تشنہم کبھی اک بیٹھ پاتا ہے

(۱۳۷)

عجم ہے بحرِ ناپیدا کرانہ
 ہے اس میں گوہرِ الماس رنگِ اک !
 مجھے کھینا نہیں ہے اس میں کشتی
 نہیں ہے اس کے دریا میں ہننگِ اک !

(۱۴۸)

چھٹا بھی تو خداوند ان افرنگی کے چنگل سے
 تو جا جا کر بہ ہر جا گورو گنبد کو کیئے جدے
 غلامی نے کیا ایسا نشیمن تیری فطرت میں
 کہ سنگِ راہ سے اپنے لیے آقا بنا ڈالے

(۱۴۹)

نہ کہہ کارِ جہاں میں استواری ہی نہیں ہے
 کہ جو لمحہ ہمارا ہے، ہے پردہ دار ابد کا
 پکڑ لے دامنِ امروز کو محکم کہ فردا
 ضمیرِ روزگاراں میں ابھی ہے چھپ کے بیٹھا

(۱۵۰)

بائے زندگانی چاک کب تک
 ارے تیرا نشیمن خاک کب تک
 ذرا پر کھول ! شاہینی بھی کچھ سیکھ
 تلاشِ دانہ در خاشاک کب تک

(۱۵۱)

نشیمن لالہ و گل میں کبھی اپنا بنا
 ذرا درسِ فغاں بھی سیکھ مرغِ نغمہ خواں سے
 اگر تو پیر ہوتا جا رہا ہے تو جوانی
 تو حاصل کر جہاں کے اس شبابِ جاوداں سے

(۱۵۲)

قسم ہے مجھ کو جاں کی جس نے نقش تن بنایا ہے
 ہوئے جلوہ نے اس گل کو آخر کر دیا دو رو
 ارے یہ جان مضطر تو ہزاروں شیوے رکھتی ہے
 بدن ہو جاتی ہے جب ایک ہی شیوے سے کر لے خو

(۱۵۳)

سنی اک قبر سے میں نے یہ آواز
 کہ زیرِ خاک بھی ممکن ہے جینا
 وہ مردہ ہے، اگرچہ لیتا ہے سانس
 جو شخص اوروں کی مرضی پر ہے زندا

(۱۵۴)

نہ ہو مایوس ہرگز دیکھ کر مشمت غبار اس کا
 پریشاں جلوہ ہے جو، اور نہ عالم پائیدار اس کا
 مگر فطرت کبھی بھی ڈھالتی ہے جب کوئی پیکر
 تو کرتا ہے تمام اک روز اس کو روزگار اس کا!

(۱۵۵)

جہان رنگ و بو فہمیدنی ہے
 ہر اک گل اس چمن کا چیدنی ہے
 کبھی اپنے دُروں پر بھی نظر کر
 کہ یہ عالم بھی ناداں دیدنی ہے

(۱۵۶)

کہا تو نے جہاں بے انت ہے اور تو ہے موجود
خدا کہتے ہیں جس کو وہ کہیں اصلاً نہیں ہے
مگر مجھ پر ابھی یہ راز ہی کھلنے نہ پایا
نظر کے سامنے جو ہے وہ ہے بھی یا نہیں ہے !

(۱۵۷)

نہ میرے خون پر مرغِ کباب اور
نہ میرے جام میں مئے آئینیہ ناب !
ہرن گو گھاس ہی کھاتا ہے میرا
مگر ہے خونِ دل میں مشکِ نایاب !

(۱۵۸)

رگِ مسلم تپاں ہے میرے ہی سوزِ جگر سے
مرے آنسو بے جاتے ہیں اس کی چشمِ تر سے
وہ تیرے محشر جاں سے ابھی تک بے خبر ہے
جہاں کو اس نے دیکھا ہی نہیں میری نظر سے

(۱۵۹)

بیاں میں آہنیں سلکتا کہ آخر لامکاں کیا ہے
ذرا دیکھ اپنے اندر ، خود بہ خود کھل جائے گا نکتہ
بدن میں اس طرح اپنا بنایا آشیاں جاں نے
کہ کہہ سکتے نہیں ہم ، جاں وہاں ہے یاں نہیں پیدا

(۱۶۰)

ہر اک دل میں جمایا عشق نے بھی رنگ اک تازہ
 کبھی پتھر سے ٹکری کبھی شیشے سے سر توڑا
 تجھے خود سے کیا بیگانہ اور اک چشم تر دے دی
 پر اپنے آپ سے نزدیک اس نے مجھ کو کر ڈالا !

(۱۶۱)

ابھی اس بندِ آب و گل سے تو چھٹنے نہیں پایا
 کہ خود کو کہہ رہا ہے تو جویوں رومی و افغانی
 و لیکن سب سے پھلے آدم بے رنگ و بو ہوں میں
 پھر اس کے بعد کہلاؤں گا ہندی اور تورانی

(۱۶۲)

غبارِ راہ کو میری کیا مشمت شرر اس نے
 مرے ذوقِ سخن نے تو جگرِ خون کر دیا میرا
 زباں کھولی تھی گفتارِ محبت میں ذرا میں نے
 بیاں نے اور بھی اس راز کو پیچیدہ کر ڈالا !

(۱۶۳)

کیا خونِ عشق کے ہاتھوں دلِ خود کام کو اس نے
 گریزاں ہو گیا آخر کو عقلِ ذوفنوں سے اب
 تم اقبالِ فلک پیما کا قصہ پوچھتے کیا ہو !
 حکیمِ نکتہ داں یہ کام لیتا ہے جنوں سے اب

پہلا پتھر

کئی عرصے سے اس کتاب کی تیاری میں
میں نے کئی کئی بار سوچا ہے کہ

افکار

میں نے اس کتاب کی تیاری میں
کئی کئی بار سوچا ہے کہ

میں نے اس کتاب کی تیاری میں
کئی کئی بار سوچا ہے کہ

پہلا پھول

چمن میں ہم نفس اپنا نظر نہیں آتا
 بہار آرہی ہے، میں گلِ نخستیں ہوں

ندی میں جھانک کے جب اپنا چہرہ دیکھوں میں
 تو اس بہانے کسی اور ہی کا رخ ہیں ہوں

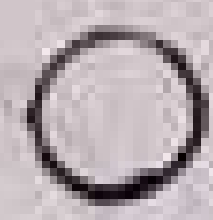
اسی قلم سے ، خطِ زندگی لکھا جس سے
 پیام اس کا ہے جس پر ، وہ برگِ رنگیں ہوں

ہے دوشِ دل میں تو آنکھوں میں عبرتِ امروز
 شہیدِ جلوۂ فردا و تازہ آئیں ہوں

میں خاک تیرہ سے اٹھا قبائے گل پہنی
 وگرنہ میں تو اک اخترِ زواجِ پرویں ہوں

دعا

اے کہ مرا فطرت کے خم خانے سے تونے جام بھرا
 آتشِ صہبا سے میری اب پگھلا دے میری سینا
 گرمی فریاد یہ میری عشق کا سرمایہ بن جائے
 شعلہ بے باک اک دن بن جائے میری خاکِ سینا
 میں مرجاؤں تو میری مٹی سے بنا لالے کا چراغ
 سوزاں کر میرے صحرا کو، تازہ کر دے میرا داغ



ہلالِ عید

تو اے ہلالِ عید ! کہاں بچ کے جاہیگا
 ہم نے پگھا رکھے ہیں نظر کے ہزار دام
 خود کو بھی دیکھ ! رنجِ تہی دامن نے کر
 سینے میں تیرے رکھا ہوا ہے میرے تمام

تسخیرِ فطرت

(۱)

میلا دِ آدم

عشق لکارا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا
حسن کانپ اٹھا کہ اک صاحب نظر پیدا ہوا

چونک اٹھی فطرت کہ اس خاکسترِ مجبور سے
ایک خودگر ، خود شکن اور خود نگر پیدا ہوا

یہ شبستانِ ازل میں پہونچی گردوں سے خبر
ہوشیار ! اے پردہ دارو ! پردہ در پیدا ہوا

آرزو نے ، بے خبر تھی جو بہ آغوشِ حیات
آنکھ کیا کھولی کہ اک عالم دگر پیدا ہوا

زندگی بولی کے مٹی میں تپی ہوں ایک عمر
تب کہیں اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا

انکارِ بلیس

نوری ناداں نہیں، خاک کو سجدہ کروں
 خاک کا پتلا ہے وہ اور میں آتش سے ہوں
 سوز سے میرے تپاں خونِ رگِ کائنات
 میں دوِ صرصر کے ساتھ میں غوتندر میں ہوں
 رابطہء سالمات ، ضابطہء امہات
 سوز میں اس میں بھروں ، ساز اسے اپنادوں
 تیرا بنایا ہوا ٹوٹے مری ضرب سے
 اور اسی خاک سے پیکرِ نو ڈھال لوں
 نقشِ گر روزگار ، گرمی جوہر مری
 موجِ دریا مری چرخ کا توڑے سکوں
 پیکرِ انجم ترا ، گردشِ انجم مری
 جان جہاں کی ہوں میں ، اس کی حیاتِ دروں
 تجھ سے بدن میں ہے جانِ جان میں مجھ سے ہے شور
 تو بہ سکوں راہ زن ، میں بہ تپش رہ نموں !
 میں کہ تنک مایوں سے سجدوں کی مانگوں نہ بھیک
 قاہرِ بے دوزخ و داورِ بے حشر ہوں
 آدمِ خاکی ہناد ، دوں نظر و کم سواد
 جنم ترے پاس لے ، میں اسے بوڑھا کروں

اغوائے آدم

زندگی سوز و ساز یا کہ سکونِ دوام ؟
 فاختہ شاہیں بنے وہ ہے تپشِ زبردوام
 غیرِ بھودِ نیاز کام نہیں اور کوئی ؟
 سرو کے مانند اٹھ ! اے بہ عملِ نرمِ کام
 کوثر و تسنیم نے تجھ سے نشاطِ عمل
 چھین لیا ؛ تاک سے پی مئے آئینہِ فام
 نیک ہو وہ یا کہ بد تیرے خدا کا ہے وہم
 لذتِ کردار چکھ ! کام اٹھا ، سیکھ کام
 اٹھ ! کہ دکھاؤں تجھے ایک نئی مملکت
 چشمِ جہاں ہیں تو کھول ، دیکھ تو لطفِ خرام
 قطرہ تو بے مایہ ہے ، گوہرِ تابندہ بن
 چھوڑ کے گردوں ٹپک ! اور ہو دریا مقام
 تیغِ درخشندہ ہے تو ، کبھی عالم پہ گر
 تیغِ کا جوہر دکھا چھوڑ کے قیدِ نیام
 بازوئے شاہیں تو کھول ، خونِ تدرِ واں تو پی
 موت ہے یہ زندگی زیرِ سکونِ کنام
 تو نے نہ جانا ابھی وصل میں ہے مرگِ شوق
 کیا ہے حیاتِ دوام ؟ سوختنِ ناتمام

(۴)

آدم بہشت سے نکل کر نغمہ سرانی کرتا ہے

ہے عجب مزہ یہ خود کو ہمہ سوز و ساز کرنا
دلِ کوہ و دشت و دریا بہ نفس گداز کرنا

یہ قفس سے چھوٹ جانا ، یہ چمن میں چھپانا !
تو کبھی ستارگاں سے یہ نیاز و راز کرنا

کبھی باگدازِ پہناں ، کبھی بانیاں پیدا !
سبھی چاک چاک پردے بہ حریم ناز کرنا

سربزم گل نظر میں کبھی سب کچھ ایک آنا
کبھی خار اور گل میں مگر امتیاز کرنا

ہمہ سوز ناتمام و ہمہ درد آرزو ہوں
وہ یقیں ہو یا گماں ہو کہ شہید جستجو ہوں

صبحِ قیامت

(آدم باری تعالیٰ کے حضور میں)

اے ترے سورج سے ہے کوکبِ جاں ^۱ مستنیر
 دل سے جلائی مرے شمعِ جہانِ ضریر
 میں نے کیا بحر کو بند بہ یک نائے آب
 ضرب سے میری رواں سینیۂ خارہ سے شیر
 زہرہ کو میری ہے چاہ ، میرا پرستار ماہ
 میری کلاں کار عقل کرتی رہی داروگیر
 زیرِ زمیں میں گیا ، اوجِ فلک پر اڑا
 بحر میں میرے بندھے ذرۂ و مہرِ منیر
 اس کے فسوں نے مجھے راہ سے بھٹکادیا
 میری خطا کر معاف ، عذرِ گنہ کر پذیر
 جگ ہنسیں ہوتا ہے رام کھائیں نہ جب تک فریب
 جزبہ کندِ نیاز ہوتا ہنسیں ناز اسیر
 یہ بت سنکیں گھلا گرم مری آہ سے
 باندھنا زناں تھا میرے لئے ناگزیر
 دام میں لاتی ہے عقلِ فطرتِ چالاک کو
 اہر منِ شعلہ زاد سجدہ کرے خاک کو

۱- روشن

۲- تاریک

۳- آبجو، ندی

خوشبو

اک حور کنج گلشنِ جنت میں مضطرب
بولی "خبر فلک سے ادھر کی، ادھر نہ آئی"

ہیں صبح و شام کیا؟ ہے شب و روز کس کا نام؟
یہ بات آج تک بھی مجھ میں مری نہ آئی

کہتے ہیں کس کو زندگی؟ ہے موت چیز کیا؟
پیچیدہ سی یہ بات کبھی مجھ پہ کھل نہ پائی

نکبت بنی پھر اور چلی سوئے شاخ گل
جنت سے نکلی 'عالمِ دو روزہ میں در آئی

کھولی پھر آنکھ اور بھرا اک کلی کا روپ
پھر بن کے پھول شاخ پہ دھیرے سے مسکرائی

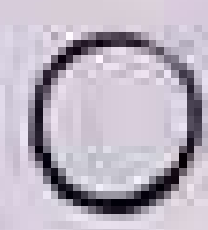
مرجھا کے برگ برگ ہوئی خاک پر گری
آغوش گل میں حیف کہ دو دن نہ لہلہائی

جنت سے بند توڑ کے نکلی تھی ناز میں
کھینچی اک اس نے آہ جو خوشبو کا نام لائی

نوائے وقت

خورشید بہ داماں ہوں ، انجم بہ گریباں ہوں
 خود فہم ہوں تو ہوں ہیچ ، خود ہیں ہوں تو میں جاں ہوں
 میں شہر و بیاباں میں ، میں کاخ و شہستاں میں
 میں درد ہوں ، درماہوں ، میں عیشِ فراواں ہوں
 میں تیغِ جہاں سوزاں ، میں چشمہٴ حیواں ہوں
 ہے میری کفِ خاک اک چنگیزی و تیموری
 ہنگامہٴ افرنگی ہے میری ہی چنگاری
 انسان اور اس کی یہ دنیا مری نقاشی
 خونِ جگرِ مرداں پھولوں کی ہے رت میری
 میں آتش سوزاں ہوں ، میں روضہٴ رضواں ہوں
 سیار بھی ثابت بھی کیا طرفہ تماشا ہوں
 امروز کے ساغر میں کیفیتِ فردا ہوں
 سینے میں چھپائے میں صدعالمِ رعنا ہوں
 سو کوکبِ غلطاں ہوں ، سو گنبدِ خضرا ہوں
 میں کسوتِ انساں ہوں ، پیراہنِ یزداں ہوں
 تقدیرِ فسوں میرا ، تدبیرِ فسوں تیرا
 لیا پہ مری تو غش ، میں دشتِ جنوں تیرا
 ان تیرے سوالوں سے ہوں پاکِ مثالِ روح
 تو رازِ دروں میرا ، میں رازِ دروں تیرا
 جاں سے تری پیدا ہوں ، جاں میں تری پہناں ہوں

منزل ہے تو، میں راہی، میں کشت ہوں، تو حاصل
 تو ساز صد آہنگ اور تو گرمی ہر محفل
 آوارۂ آب و گل ا ڈھونڈ اپنا مقام دل
 ساغر میں سمایا دیکھ ا یہ قلم بے ساحل
 میں تیری ہی موجوں کا مچلا ہوا طوفاں ہوں



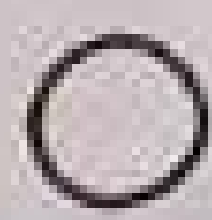
حیاتِ جاوید

گماں نہ کر کہ ہوا ختم اب یہ کارِ مغان
 ہزار بادۂ ناخوردہ شاخِ تاک میں ہے

چمن تو خوب ہے لیکن مثالِ غنچہ نہ جی
 حیات جس کی قبائے چاک چاک میں ہے

ہے رمزِ زیست اگر تجھ پہ فاش، تو مت ڈھونڈ
 وہ دل کہ جو خلشِ خارِ آرزو سے ہو پاک

سمٹ کے آپ میں مضبوط کوہ صورت، جی
 نہ مثلِ خس، کہ ہوا تیز، شعلہ ہے بے باک



فصلِ بہار

(۱)

آگئی دشت و کوہ میں فصلِ بہارِ گلِ فشاں
 طوطی و سارِ نغمہ خواں
 مرغ ہزار داستاں
 بہتی ہوئی یہ ندیاں
 لالہ و گل ہیں صنوفشاں
 کھول کے آنکھ دیکھ عیاں
 آگئی دشت و کوہ میں فصلِ بہارِ گلِ فشاں

(۲)

اٹھ کہ وہ باغ و راغ میں پہونچی گلوں کی پاکی
 باد بہار چل پڑی
 تھمڑیں طیور بانسری
 چاک قبائے لالہ بھی
 حسن چنے کلی کلی
 عشق کی جان پر بنی
 اٹھ کہ وہ باغ و راغ میں پہونچی گلوں کی پاکی

(۳)

نغمہ نواز بلبلیں ، مرغ بہار پُرِ خروش

خونِ چمن ہے گرم جوش

بیٹھا ہوا ہے کیوں خموش

توڑ دے ہر فسوںِ ہوش

کرمئے معنی بڑھ کے نوش

چھیز کے گیت ، گل بہ پوش

نغمہ نواز بلبلیں ، مرغ بہار پُرِ خروش

(۴)

چھوڑ کے حجرہ باہر آ! گوشہٴ دشت ڈھونڈ، کوئی

جوئے رواں پہ بیٹھ بھی

بہتی ہے دیکھ کیا ندی

زرگیں ناز مد بھری

باصد ادائے دل بری

اس کی جہیں ہے چومتی

چھوڑ کے حجرہ باہر آ! گوشہٴ دشت ڈھونڈ، کوئی

(۵)

دیدۂ معنی اپنا کھول ، تو ہے عیاں سے بے خبر

لالہ کھلا کر کر

آگ کا کرتہ جسم پر

شعبنم اشک سے ، بحر

اس کا جگر کرے ہے تر

تارہ شفق پہ جلوہ گر

دیدۂ معنی اپنا کھول ، تو ہے عیاں سے بے خبر

(۶)

خاکِ چمن کرے ہے فاش ، رازِ درونِ کائنات

بود و نبودِ کل صفات

جلوہ ثنائی ہائے ذات

کہتا ہے جس کو تو حیات

جس کا تو نام دے ممت

حاصل انھیں نہیں ثبات

خاکِ چمن کرے ہے فاش ، رازِ درونِ کائنات

افکارِ انجم

(۱)

کہا تارے نے اک تارے سے اک دن ہمارے بحر کا ساحل نہیں ہے
سفر لکھا ہے فطرت میں ہماری مگر اس کی کوئی منزل نہیں ہے

(۲)

اگر تارے یہی ہیں جو کہ ہم ہیں تو اس دیرینہ تابی سے ملا کیا
گرفتارِ کندِ وقت ہیں ہم خوشا جس نے وجود اپنا نہ پایا

(۳)

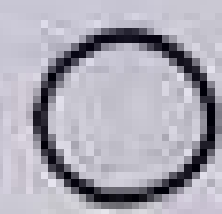
کسی سے بوجھ یہ بھاری نہ اٹھ پائے یہ بود؟ اس سے نبودِ جاوداں خوب
نہ بھائی یہ فضائے نیلگوں کچھ بلندی سے، وہ نیچا خاک داں خوب

(۴)

خوشا انساں کہ جس کی جاں ہے بے تاب جو اسپِ وقت پر بیٹھا ہوا ہے
قبائے زندگی ہے چست اس پر کہ تازہ کار اس کی ہر ادا ہے

زندگی

یہ کہہ رہا تھا شبِ ابرِ بہارِ رورو کر
 کہ زندگی تو فقط گریہ اور ماتم ہے
 چمک کے برقِ سبک سیر یہ لگی کہنے
 ہنیں ہنیں یہ تبسم ہے گرچہ یک دم ہے
 نہ جانے کس نے خبر یہ چمن میں پہونچادی
 مکالمہ گل و شبنم میں یہ جو باہم ہے



علم اور عشق کے درمیان مکالمہ

علم

نگاہِ میری محیطِ کارِ عالم
 کہ ہے میرا گرفتارِ اکِ زمانہ
 نظرِ میری کھلی ہے اس جہاں پر
 ہنیں گردوں پہ میرا آب و دانہ
 کہ میرے ساز میں نغمے بھرے ہیں
 سرِ راز میرے سب کھلے ہیں

عشق

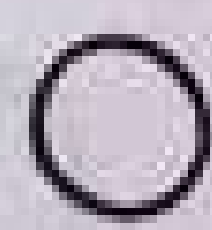
ترے افسوں سے شعلہ زار دریا ہو گیا ہے
ہوا ہے زہر آلود اور بنی آتش کدا ہے

جو میرا دوست ہوتا تو تو یکسر نور ہوتا
تبھی تو نور تیرا نار بن کر رہ گیا ہے

لیا ہے جنم گولاہوت کے خلوت کدے میں
مگر تو جال میں ابلیس کے جا کر پھنسا ہے

اب آ اس خاکداں کو گلستاں کر جہانِ پیر کو پھر سے جوان کر
اٹھا لے درد دل کا ایک ذرہ زمیں کو اک بہشتِ جادواں کر
ہم آخر کو ہیں اک دوجے کے ہمدم

کہ زیر و بم اسی نغمے کے ہیں ہم



تاروں کا گیت

یہ گردش ہماری ، ہمارا نظام

یہ مستی ہماری ، ہمارا خرام

یہ گردش ہماری کہ ہے بے مقام

اسی میں ہماری حیاتِ دوام

کہ دورِ فلک ہے ہمیں بامرام یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام !

نظر میں لینے جلوہ گاہِ شہود

یہ سارے صنم خانہ ہائے نمود

یہ ہنگامہء رزمِ بود و نبود

یہ جو کشمکش ہے برائے وجود

یہ ، المختصر عالمِ دیر و زود یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام !

یہ جاری ہے جو گرمی کارِ زار

ہویدا ہے جو خامی پختہ کار

کہیں تخت و تاج اور کہیں تیغ و دار

کہیں خوار ہوتے ہوئے شہریار

یہ ہر روز کی بازیِ روزگار یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام !

گیا خواجہ اور خواجہ کی سروری

غلاموں کی رخصت ہوئی چاکری

رہی اب وہ زاری نہ وہ قیسری

چلا بھی گیا دورِ اسکندری

نہ باقی رہا شیوہٴ بت گری یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام !

فروشنده بھی ہے پہ خاکِ خموش
 کبھی سست رو ہے کبھی سخت کوش
 جمائے کہیں محفلِ نائے و نوش
 تو نکلے کہیں پر جنازہ بہ دوش
 ہے میرِ جہاں تو کہیں سَفْتِ گوش یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام !
 تو محوِ طلسمات صد چون و چند
 خرد تیری رہن کشاد اور بند
 غزالوں کی صورت ہے زیرِ کمند
 فقط خوار و زار و زبون و نژد
 ہمارا نشیمن ہے لیکن بلند یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام !

یہ پردہ ہے کیا ؟ اور کیا ہے ظہور ؟
 ہے کیا اصلِ ظلمت ؟ ہے کیا اصلِ نور ؟
 دل و چشم کیا ہیں ؟ یہ کیا ہے شعور ؟
 کسے کہتے ہیں فطرتِ ناصبور ؟
 یہ نزدیک کیا بات ہے ؟ کیا ہے دور ؟ یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام !
 یہ تیرا زیادہ ، ہمارا ہے کم
 ہے جو سال تیرا ، ہمارا ہے دم
 ارے تیرے دامن میں ہیں بحرِ ویم
 مگر تو کہ شبنم پہ دیتا ہے دم

تلاشِ عالموں کی ہمیں دم بہ دم یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام !

نسیمِ صبح

محیظِ بحر و سرِ کوسار سے چل کر
 میں آ رہی ہوں مگر مجھ کو یہ نہیں ہے خبر
 کہ میری اصل ہے کیا؟ میں کہاں سے نکلی ہوں؟
 وطن ہے میرا کہاں؟ بس یہی میں سوچتی ہوں!
 سنائی غم زدہ طائر کو میں نے خوش خبری
 کہ آ رہی ہے بہاراں کی دل نواز پری
 گرائے میں نے ہی پھر اس کے آشیاں کے تلے
 سفید پھول وہ چاندی سے کچھ چنبیلی کے
 کبھی میں سبزے سے اٹھکھیلیاں کئے جاؤں
 تو شاخِ لالہ سے لگ کر کبھی میں بل کھاؤں
 کچھ ایسے اس کے مسامات میں سماؤں میں
 کہ اس کی بو ہی نہیں رنگ بھی اڑاؤں میں
 کچھ ایسے چھوتی ہوں میں برگِ لالہ و گل کو
 کہ میرے تھونے سے ان کی خمیدہ شاخ نہ ہو
 کرے جو شاعر غم آشنا بھی آہ و بکا
 تو ساتھ دیتی ہوں میں بھی نفسِ نفسِ اس کا

باز کی نصیحت اپنے بچے کو

ہے بازوں کا جوہر تو ایک اے پیرا
 ہو خوش شہوہ اور نیک تدبیر جی
 نہ اپنا کبھی صحبتِ کبک و سار
 ہے قوم ان کی چھوٹی، بڑی ترسناک
 بنا باش، صید اپنے نچیر کا
 گیا شکرہ جب بھی سوائے روئے خاک
 نظر خود پہ رکھ اور خورسند جی
 تن نرم و نازک ہے ہے تیہو کا تن
 یہ سنگینی محنت و پر دمی
 کے اپنے پیٹے سے کیا خوب عقاب
 حذر آہو و میش سے الحذر
 یہ ہے بوڑھے بازوں کا قول اے پیرا
 ہمارا نشیمن نہیں باغ و کشت
 زمیں سے ہے دانے کو چننا خطا
 وہ شاہیں جو رکھے قدم خاک پر
 ہے شاہین کے حق میں اک فرش، سنگ
 کہ تو زرد چشمان صحرا سے ہے
 جوان اسیل اک بہ وقتِ جدال
 ازانوں میں ہے سطوتِ نوریاں
 یہ گردون گرداں، ہے خم جس کی پشت
 نہ کر دوسرے کا نوالہ پسند

کہ بن نیک انیکوں کی رکھ یاد پسند

کتاب کا کپڑا

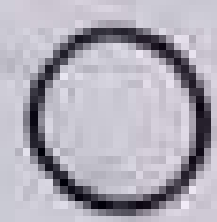
کتاب خانے میں اپنے میں نے سنا ، شب
یہ پروانے سے بولا کرم کتابی

کہ اوراق سینا میں ڈالا ہے ڈیرہ
پڑھا غور سے نسخہ فاریابی

مگر حکمتِ زندگی کھل نہ پائی
کرے دن کو تیرہ یہ بے آفتابی

تو پروانہ بولا جو تھا ادھ جلاسا
یہ نکتہ نہیں میرے بھائی ! کتابی

تمیش ہی کرے زندہ تر زندگی کو
تمیش ہی تو دے بال و پر زندگی کو



- ۱- بوعلی سینا
۲- شہیر فاریابی

(ص ۹۲ کا حاشیہ) ۱- ڈرنے والی ۲- چونچ ۳- بازی قسم کا ایک شکاری پرندہ
۴- ہرن کے سینگ ۵- جنگ ، لڑائی ۶- پلنگ ، چیتا ۷- آنکھ کی پتلی
۸- شامین کافی کیونکہ اس کا رنگ سفید ہوتا ہے (مستزم)

کبر و ناز

بونی بڑے غرور سے تیخ^۱ جوئے^۲ کوہ سے
تجھ سے ہمارا تلخ^۱ ہوا جائے روزگار

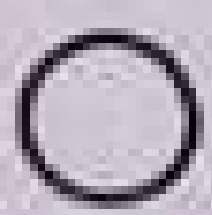
گستاخ تیرا گیت ہے ، بے باک تیری چال
ہر سال شوخ تر ہے تو آوارہ تر ہزار

تو خاندانِ کوہ کے شایانِ شاں نہیں
خود کو نہ کہہ تو دخترکِ ابرِ کوہسار

گرتی ہے ، لڑکھڑاتی ہے ، رلتی ہے خاک میں
لے اور کوئی رہ ، ہو رواں سوئے مرغِ زار

بولی ندی کہ " بات نہ کر ایسی دل شکن
خود پر اکڑ نہ ، چھوڑ یہ میں پن کا کاروبار

جاتی ہوں میں کہ میں نہیں اس کوہسار سے
خود کو بچا تو مہرِ درخشاں کی مار سے "



لالہ

وہ شعلہ ہوں ازل کے دن آغوشِ عشق میں
پہلے ، نمودِ بلبل و پروانہ سے ، اٹھا

سورج سے بھی فزوں ہوں ، ہر اک ذرے پر محیط
گردوں نے اپنا شعلہ مری تاب سے لیا

مثلِ نفس ہوں سینیۂ گلشن میں میں مقیم
نم کر کے مجھ کو شاخ نے خود میں سمولیا

کھینچا یہ میرا سوز، کہا میرے برے میں رہ
لیکن دلِ ستم زدہ میرا نہ رہ سکا

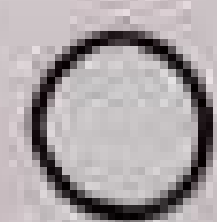
میں تنگنائے شاخ میں کھاتا تھا تیج و تاب
آخر کو سوئے جلوہ گہ رنگ و بو گیا

شبنم نے میری راہ میں موتی بہت لٹائے
خنداں تھی صبح ، گرد مرے گھومتی صبا

بلبل نے گل سے جانا کہ میں کھوچکا ہوں سوز
رو کر کہا کہ ہستی کی مہنگی پڑی قبا

تب سے میں اپنا کھول کے سینیہ پڑا ہوا
ہوں صبح و شام منت خورشید اٹھا رہا

اس آس میں کہ مجھ پہ کرم کی نظر پڑے
مل جائے مجھ کو شعلہ وہ واپس، جو بجھ گیا

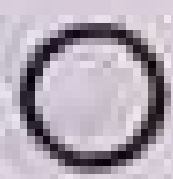


حکمت و شعر

بو علی سینا ہوا ہے گم غبارِ ناز میں
دستِ رومی کی رسائی پردہٴ محفلِ تلک

غوطہ زن ہو کر وہ پہونچے گوہرِ تابندہ تک
بو علی گرداب میں گم ، جیسے خسِ منزلِ تلک

حق اگر بے سوز ہو تو حکمتِ بے مایہ ہے
شعر بن جائے جو حکمتِ سوزِ دل سے کام لے

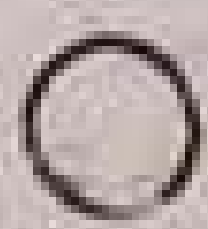


حقیقت

عقابِ دور میں نے مرغِ آبی سے کہا اک دن
ارے ہے یہ سراب! آنکھوں سے اپنی دیکھتا ہوں میں

جواباً مرغِ حق اندیش نے اس کو یہ بتلایا
فقط تو دیکھتا ہے ، یہ ہے پانی جانتا ہوں میں

وہیں آئی صدا ماہی کی اس گہرے سمندر سے
ارے یہ عالمِ پر ہیچ و تاب اک اور ہی شے ہے !



جگنو

اک ذرہ بے مایہ متاعِ نفس جو لے کر آیا
پروانہ پن سیکھا، اس کو شوق نے اتنا تپایا !

دامنِ شب چمکایا

تھکی کرن اک چلی تھی، بن کر گرہ شرر بن بیٹھی
سوز تھا ایسا حیات کا اس میں یکسر زربن بیٹھی

شاہِ نظر بن بیٹھی

پروانہ جب بے تابانہ ادھر ادھر پر مارے
شمع سراپا بن جائے یوں شمع پہ خود کو وارے

” میں ” اور ” تو ” سب ہارے

یا وہ کوئی تارا ہے اک چرخِ بریں پر اونچا
آیا ہے نزدیک سے کرنے اس دنیا کا تماشا

ایک کھیں میں بیٹھا

یا پھر وہ اک چاند ہے جو بس ایک جھلک دکھلائے
سورج کی کرنوں کا کوئی احسان نہ سر پر اٹھائے

آزاد رہے اور جائے !

اے شب کو چمکانے والے ! تو ہے سراپا نور
تیری یہ پرواز ہے کیا، اک عالمِ غیب و حضور

اور اک آئینِ ظہور !

تیرہ شبوں میں تیرے ہستی اک مشعل ہے گویا

اللہ اللہ سوز یہ تیرا تاب و تاب ہے سراپا

گرمِ طلب ہے ایسا

ہاں ہم بھی تو تیری ہی مانند اس خاک سے اٹھے

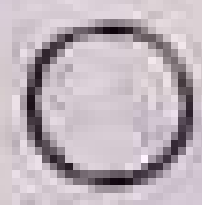
دیکھ دیکھ کر تڑپے ہیں ہم، نہ بھی دیکھیں تو تڑپے

اور کہیں نہیں پہونچے

سن لو میری بات کہ اس کی بڑی ہے گہری تھاہ

کھوئی ہوئی منزل کی نہ پوچھو، پکڑو اپنی راہ

اس جلوے پہ رکھو نگاہ!



حدی

(ساربانِ حجاز کا گیت)

ناقہ ۶ گرداں مرے
میرے ہرن دوڑتے
زر مرے ، زیور مرے
بیش مرے ، کم مرے
اے مرے دولت کدے!

گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں !

دل کش و نہبا ہے تو
شاید رعنا ہے تو
حورِ دل آرا ہے تو
غیرتِ لیلیا ہے تو
دخترِ صحرا ہے تو

گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں !

تیز ہو جب آفتاب
تجھ کو ہے پانی سراب
جب ہو شبِ ماہتاب
دوڑے تو مثل شہاب
دور ہے آنکھوں سے خواب

گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں !

لکڑی
کشتی
مس
تجھ
مخت
دل
سارباں

گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں !

سوز ہے تیری زمام
ساز ہے تیرا خرام
خالی شکم ، تشنه کام
پاب سفر صبح و شام
خستہ ہو کر کے مقام

گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں !

شام یمن میں تری
صبح قرن میں ہوئی
ریت ترے پانو کی
نرم و سبک پھول سی
ہرنی ختن کی کوئی

گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں !

ختم سفر چاند کا

واہیوں میں جا چھپا

صبح کا چہرہ کھلا

چاک ہے شب کی قبا

آئی وہ ٹھنڈی ہوا

گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل ہمیں

نغمہ مرا دل کشا

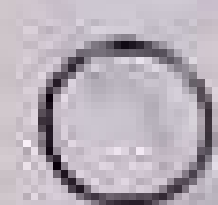
اس کی ہے لے جاں فزا

صورتِ بانگِ درا

فتنہ ربا ، فتنہ زبا

اے بہ عرم چہرہ سا

گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل ہمیں



بارش کا پہلا قطرہ

مرا معنی تازہ ہے مدعا
 اگر پھر کہوں تو نہیں ناروا !
 کہ اک قطرہ بارش کا گرنے کو تھا
 جو دریا کو دیکھا نخل ہو گیا
 کہ دریا کہاں اور یہ میں کہاں
 وہ ہستی ہے میں نیستی ، الاماں
 مگر آئی دریا سے فوراً صدا
 تنک مائیگی سے نہ منہ یوں چھپا
 نظر میں ہیں تیری چمن ، دشت و در
 کیا ہے تماشائے شام و سحر
 ہے گہر برگ پر ، گہر بہ دوش سحاب
 کبھی تجھ کو چمکاتا ہے آفتاب
 کبھی تشنہ کاموں کا ہمدم ہے تو
 کبھی سینہ چاکوں کا محرم ہے تو
 کبھی تاک میں ہے تو طاقت گداز
 کبھی خاک میں مل کے بے سوز و ساز
 تو پیدا ہوا ہے مری موج سے
 مٹی سے تو ابھرے مٹی میں ملے
 کر آرامی آکر مرے سینے میں
 چمک مسل جوہر اس آئینے میں
 گہر بن کے آغوش قلزم میں جی
 — روشن سوا زندگی

خدا اور انسان کے درمیان ایک مکالمہ

خدا

بنایا جہاں میں نے اک آب و گل سے تو ایران و تاتار تو نے بنائے
 نکالا ہے مٹی سے فولاد میں نے تو تیر اور تلوار تو نے بنائے
 شجر کلٹنے کو تیر تو نے ڈھالا
 بنایا قفس طائر نغمہ زن کا !

انسان

رات بنائی تو نے اگر تو میں نے چراغ بنایا
 تو نے بنائی مٹی اگر تو میں نے ایام بنایا
 تو نے بنائے اگر بیابان و کہسار و راع
 کئے آراستہ میں نے خیابان و گلزار و باغ
 میں وہ ہوں جو پتھر سے بھی اک آئینہ بنالوں
 ہاتھ آجائے زہر تو اے

ساتی نامہ

(نشاط باغ کشمیر میں لکھا گیا)

زہے موسمِ گل ، خوشا نو بہاراں
 چکوروں کے پر جیسی خوش رنگ دھرتی
 فقط لالہ و گل پہ ٹھہریں نگاہیں
 لب جو پہ عنچے کی آئینہ بندی
 یہ شیریں نوائیں ، یہ دل کش صدائیں
 پڑی تن میں جاں ، جاں میں جاگیں امنگیں
 طیور بلند آشیاں کے یہ نغمے
 یہ گویا بہشت بریں اک خدا نے
 کہ رحمت سے اس کی ذرا آدمی کی
 تو چاہوں بھی کیا میں ، اگر میں نہ چاہوں
 ترے صدقے ! اے ساتی ماہ سیمہ !
 چمک جس کی نوری ، جلانے میں ناری
 اٹھا خاکِ مردہ سے اک قومِ زندہ
 کہ کاشاں سے تا کاشغرا ٹھ رہی ہے
 گرائے ہیں وہ اشک ناب ان ام نے
 غلامی کے خوگر یہ کشمیر باسی
 خیال بلند ان کے دل میں نہ آئے
 بریشمِ قبا خواجہ محنت سے ان کی
 فروغِ نگہ ہے نہ آنکھوں میں ان کی
 چھڑک قطرہ اس مئے کا کشمیریوں پر
 کہ خاکستر ان کی بھی ہو شعلہ باراں



شاہین و ماہی

ماہی بچہ شاہین بچے سے کہتا تھا اک دن
یہ سلسلہء موج کہ ہے دریا ہی دریا

ہے خوف کا گھر، بڑھ کے ہے بادل سے گرج دار
اک خانہ ہے ہر دیدہ و نادیدہ بلا کا

ہے سیل گراں سنگ، رواں اور زمیں گیر
تابندہ گہر جس میں ہیں اور لولوئے لالا

اس سیل ہمہ گیر سے بچنا نہیں ممکن
ہے سر پہ وہی اور تہِ پاؤں ہمہ جا

ہر لحظہ جواں اور رواں اور دواں ہے
ایام کی گردش سے نہ بڑھتا ہے نہ کھٹتا

ان باتوں سے اس بچے کا چہرہ چمک اٹھا
شاہین بچہ ہنستا ہوا پر کھول کے نکلا

بولا میں ہوں شاہین مجھے کیا کام زمیں سے
نیچے مرے پر کے ہیں وہ دریا ہو کہ صحرا

چھوڑ اب یہ سر آب ہو پہنائے ہوا میں
مجھے یہ وہی جس کو ملا دیدہ بنیا

تنہائی

گیا میں سوئے بحر اک دن ، کہا یہ موج مضطر سے
 بجھے بس اک طلب ہے ، یہ بتا مشکل ہے کیا تیری
 ہزاروں لولوئے لالہ سے پُر تیرا گریباں ہے
 درون سینہ میرا سا ، بتا رکھتی ہے تو دل بھی
 تڑپ کر ایک دم ساحل سے نکلی اور چپ سادھی !
 چلا پھر کوہ کی جانب ، کہا کیا ہے یہ بیدردی
 کہ کانوں تک ترے آہ و فغان غم زدہ پہونچی ؟
 یہ سنگِ لعل تیرا قطرہ خوں سے بنا ہے گر
 ادھر آ اور یہ مجھ غم زدہ سے بات کر تھوڑی
 بہ خود گم ہو کے گہری سانس چینی اور چپ سادھی !
 کیا طے اک سفر لبہا ، کہا ماہِ درخشاں سے
 سفر ہی تیری قسمت ہے ، تری منزل بھی ہے کوئی ؟
 ترے پرتو سے یہ سارا جہاں ، ٹھہرا سمن زار اک
 چمک داغوں کی تیرے ، جلوۂ دل سے ، بتا ہے بھی ؟
 رقیبانہ سوئے انجمِ نظر کی اور چپ سادھی !
 گیا پھر حضرتِ یزداں میں ، ماہ و مہر سے گزرا
 تری دنیا میں اک ذرہ ہنسی ہے آشنا میرا
 جہاں تیرا تہی دل سے ، یہ مشیتِ خاک دل ہی دل
 چمن یہ خوب ہے ، پر کب ہے در خوردِ نوا میرا
 ہنسی سی ایک اس کے لب پر آئی اور چپ سادھی !

ششہنجم

فرمایا کہ اوج مہ و پرویں سے اتر آنا !
خود ہو کے فنا ، بحر پر آشوب میں مل جا

موجوں سے لپٹ جا

اک نقشِ دگر لا !

بن سہ موتی چمکتا

اور میں نے کبھی عشرتِ دریا نہ خریدی
وہ مئے جو کرے مجھ سے مجھے دور نہ چکھتی

اور خود کونہ ہاری

آفاق سے پ اتری

اور لالے پہ مسکی

گل پوچھے ہے ہنگامہ مرغانِ سحر کیا
ہے انجمنِ آراستہ بالائے شجر کیا

ہے زیرِ وزبر کیا ؟

پایانِ نظر کیا ؟

خارجِ گلِ تر کیا ؟

تو کون ہے ؟ میں کون ہوں ؟ یہ ہم نفسی کیا ؟

شاخوں پہ مری کیا یہ بلبل کا ہے نغمہ ؟

مقصودِ نوا کیا ؟

مطلوبِ صبا کیا ؟

ہے کہنہ سرا کیا ؟

میں نے کہا " یہ رزم گہر زیت ہے بھائی
اس بزم کا شیرازہ ہے کیا ، ذوقِ جدائی

دم ، گرم نوائی

جاں ، چہرہ کشائی

ہے رازِ خدائی

افلاک سے میں ٹپکی ہوں ، تو خاک سے پھوٹے
ہے ذوقِ نمود اب کوئی پھوٹے کوئی ٹپکے

تو شاخ میں تڑپے

چہرے کئی پردے

اور آپ کو پہونچے

نم ہے رگِ دوراں میں مرے اشکِ بحر کا
یہ زیرِ وزیر کچھ نہیں دھوکا ہے نظر کا

تارا مرے بر میں

بٹھٹھا ہے جگر میں

ہے نورِ بصر میں

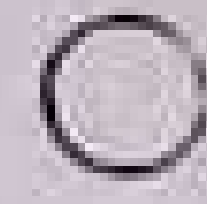
گوخار بھی ہے پیرِ سنِ شاہد گل میں
یہ بھی ہے مگر اجمنِ شاہد گل میں

بس عشق میں تڑپے

پہلو میں ہے گل کے

ہے موسمِ گل سے

اٹھ ! صحبت دیرینہ سے دل اپنا اٹھالے
 اور لالہ، خورشید سے آنکھ اپنی لڑالے
 کر مجھ سے ذرا ساز
 بن مجھ سا فلک تاز
 ہے بھی سر پرواز

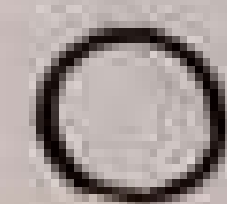


جگنو

سنا میں نے، یہ جگنو کہہ رہا تھا
 کہ میں کیڑا ہوں لیکن بے ضرر ہوں

جلا جاسکتا ہے بے منتِ غیر
 میں پروانہ کہاں اے بے خبر ہوں

ہے تیرہ شب تو کیا، خود کو جلا کر
 خود اپنا میں چراغِ رہ گزر ہوں



عشق

فکر نے میری اٹھایا جستجو میں جب قدم !
دیر میں پہونچی ، کبھی تھی برسِ صحنِ حرم

دوڑتی دشتِ طلب میں پھرتی تھی شام و سحر
اک بگولے کی طرح دامن کو اپنے کھینچ کر

بے خضر اس راستے میں تھی سوئے منزل رواں
دوش پر تختِ تخیل کے تھی باندھ کر مجمل رواں

توڑ کر ساغرِ تماشِ مئے میں سرگرداں پھری
صبح کے مانند محوِ سعیِ لاحاصل رہی

موج کے مانند کھاتی تاؤ اپنے آپ پر
اور صحرا کے بگولے کی طرح آوارہ تر

عشق تیرا دل پہ تب ناگاہ مستولی ہوا
ہرگرہ کاموں کی میرے کھل گئی صلِ علیٰ

ہو گیا تب فاش مجھ پر ستر ہر بودو عدم
عقل کا بت خانہ میرا بن گیا سخنِ حرم

میرے فرمن سے ہوا پھر برق کا ایسے گزر
جلنے میں لذت ہے کیا ، یہ ہو گئی مجھ کو خبر

ہو گیا سرصمت اتنا ، لڑکھڑا کر گر پڑا
عکس صورت ہو گیا میں آپ اپنے سے جدا

عشق میری خاک کو پھر عرش پر پہونچا گیا
راز اک ایسا مرے دل کے حوالے کر دیا

ہو گیا کشتی کا میری اس کے ساحل سے وصال
ہو گیا ہر زشت میرا نذرِ طوفانِ جمال

اب تو میں ہوں اور مرے لبِ عشق کے افسانہ چیں
کوئی پروائے ملامت اب مرے دل کو نہیں

عالم کے جلووں سے اب میں ہو گیا ہوں بے نیاز
تپ رہا ہوں ، رو رہا ہوں ، سربہ سر سوزوگداز

اگر جینا ہے خطروں سے اچھ جا!

ہرن یہ کہہ رہا تھا اک ہرن سے
"سپنہ صحنِ حرم میں چل کے ڈھونڈیں

کہ صحرا میں شکاری تاک میں ہیں
نہ تو صبحیں ہماری ہیں نہ شامیں

کہاں تک لٹنے و صیاد جھیلیں
دل اس اندیشے سے آزاد رکھیں !

رفیق اس کا یہ بولا "اے فرد مند !
اگر جینا ہے خطروں سے اچھ جا

کسوٹی پر مسلسل آپ کو رکھ !
زبانِ تیغ پر چلنا ہے جینا !

خطر تاب و تواریخ کا امتحان ہے
عیارِ ممکناتِ جسم و جاں ہے "

جہانِ عمل

یہ میکہہ ہے اور یہاں ہے صلائے عام
ملتی ہے مئے یہاں تو بہ اندازہ ہائے جام

وہ حرفِ راز جو کہ نہیں صوت آشنا
ٹپکے ہے لب سے جام کے ، ٹھہرا ہے وہ کلام

نشہ چرہا ہے حال کا ، چھوٹا مقامِ قال
اور نکتہ ہائے فلسفہ کچھ ہیں تو دردِ جام

اس راہ میں تو دہر کی ہم نے تھکادی سانس
خورشیدِ صبح اس کا ہے یاں آفتابِ شام

اے وہ کہ اپنی بھول پہ بھولا ہوا ہے تو
ساکن جسے تو سمجھے ہوئے ہے وہ ہے خرام

گھر سے نکل کے پائے طلب ہو سکے نہ شل
جاں میں جو بویا بیچ تو پیدا ہوا عمل

زندگی

پوچھا یہ اک بلند نظر سے، ہے زیست کیا
 بولا وہ مئے کہ تلخ ہو جتنی، ہے خوب تر

پوچھا کہ کیوں یہ جگنو نے گل سے نکالا سر
 بولا ہے شعلہ زاد سمندرسا، اے سپر

پوچھا کہ کیوں یہ فطرتِ خاموش میں ہے شر
 بولا کہ اس کا خیر نہ دیکھا بھی ہے شر

پوچھا کہ شوقِ سیر کی منزل نہیں ہے کوئی
 بولا کہ منزل اس کی بھی لذت سفر

پوچھا کہ کیوں یہ سوہنے ہیں خاکِ خاک میں
 بولا کہ دانہ پھوٹے تو ہے پھول سربِ سر

حکمتِ فرنگ

سنا میں نے فارس میں اک شخص تھا سخن رس ، ادا فہم ، رمز آشنا
 بڑی جاں کنی سے گزر کر مرا تھا دل جاں کنی سے شکایت بھرا
 گیا نالہ کش پیشِ یزدانِ پاک اجل نے کیا میرا دل چاک چاک
 نہیں سیکھا بالکل بہ این یک فنی اجل نے فنِ تازہ جاں کنی
 ہے ناپختہ یکسر ہر اک کارِ مرگ جہاں نو ہوا ، وہ وہی کہنے برگ^۱
 فرنگی کے سارے ہمز ہیں شگرف^۲ وہ قطرے سے پیدا کرے بحرِ ژرف^۳
 گھماتی ہے فکر اس کی پرکارِ مرگ کہ حکمت ہے اس کی پرستارِ مرگ
 ہیں مثلِ ہنگ آب دوزیوں رواں تو طیارے اس کے ہیں شعلہ فشاں
 کہ چشمِ جہاں بین خورشید بھی نئی اس کی گسیوں سے اندھی ہوئی
 جو بندوق سے اس کی گولی چلے اجل کے فرشتے کی جاں پر بنے
 اس احمق کو اب بھیج سوئے فرنگ
 کہ سیکھے فنِ کشتنِ بے درنگ^۴ !

حور و شاعر

(گوئیں کی نظم موسوم بہ "حور و شاعر" کے جواب میں)

حور

نہ تو مئے کو منہ لگائے نہ نگاہ مجھ پہ ڈالے
ہے عجب کہ تو نہ جانے رہ و رسمِ آشنائی

ہم سازِ جستجو ہے ، ہم سوزِ آرزو ہے
یہ تری نفسِ گدازی ، یہ تری غزلِ سرائی

کرے اپنی لے سے پیدا وہ جہانِ دل کشا تو
کہ ارم دکھائی دیتا ہے طلسمِ سیمیائی !

شاعر

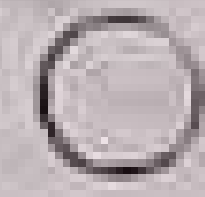
یہ تری چبھتی ہوئی باتیں ہیں بے حد دل فریب
پھر بھی نوکِ خار کی لذت ہے کچھ اس سے سوا !

کیا کروں لکھا نہیں ہے میری فطرت میں قیام
میرے سینے میں دلِ مضطر ہے اک مسلِ صبا

جب نظر رکتی ہے میری اک نگارِ خوب پر
تب نگارِ خوب تر کو ڈھونڈتا ہے دلِ مرا

میں شرر سے تارہ ڈھونڈوں تارے سے پھر آفتاب
شوقِ منزل ہی نہیں ، ہے موت رک جانا مرا

جب بہاروں کی شرابوں سے میں بھرتا ہوں قدح
 تو غزل سے اپنی پھر اک چھیڑتا ہوں سُرنیا
 ہے طلب مجھ کو ہنایت کی ، جو ہے بے انتہا
 بازگاہِ ناشکیب و قلبِ امید آشنا
 عاشقوں کا دل تو مرجاتا ہے باغِ خلد میں
 غم نہ کوئی غم گساری اور نہ پُر درد اک نوا !



ہتذیب

انساں کہ جس نے غازۂ ہتذیب تھوپ کر
 چہرے کو اپنے تازہ و روشن بنالیا

دستاۓ حریر میں پنچے کو ڈھانپ کر
 خنجر چھپا کے اس نے قلم کو اٹھالیا

ڈالی طرح صنم کدۂ صلحِ عام کی
 رقصاں ہوا ، سرود کا جادو جگالیا

خون ریز ہو کے جنگ کے چھڑتے ہی کھل گیا
 اک دوسرے کو دشمن خونیں بنالیا !



زندگی و عمل

(ہائٹنا کی نظم موسوم بہ "سوالات" کے جواب میں)

اکتا گیا تھا جینے سے ساحل پڑے پڑے
 بولا کہ مجھ پہ کھل ہی نہ پایا میں کون ہوں
 سن کر یہ موج تیز فرامیدہ نے کہا
 ٹھہروں تو میری موت ہے، زندہ ہوں جب چلوں!

○ الملکُ اللہ

طارق نے اندلس میں جلائیں جو کشتیاں
 بولے "خرد کی رو سے سراسر ہے یہ خطا
 ہم دور ہیں وطن سے سولوٹیں گے کس طرح،
 ترکِ سبب کا حکم شریعت نے کب دیا؟"
 طارق نے ہنس کے تھام لی شمشیر اور کہا
 "میرے خدا کا ملک ہے جو ملک ہے مرا"

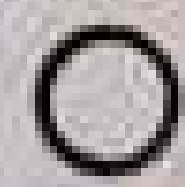
جوئے آب

دیکھو تو جوئے آب رواں مست مست ہے مانند کہکشاں سوئے گھزار و مرغ زار
 اک عمر رہ کے ابر کے جھولے میں مست خواب کھولی پھر اس نے آنکھ بہ آغوش کوہسار
 تھے سنگرزے نغمہ گر اس کے غرام سے آئینہ ساں جبیں ہوئی بے رنگ و بے غبار
 کیا خوب جوئے آب ہے مستانہ خوش غرام

خود سے یگانہ ، سب سے ہے بیگانہ خوش غرام
 لے کر بہار آئی پری خانہ راہ میں نرگس کھلی ، چنبیلی کھلی ، موتیا کھلا
 عشوے دکھا کے گل نے کہا اک ذرا ٹھہرا دامن پکڑ کے غنچے اسے کھینچنے لگا
 وہ سبز پوش جلوہ فروشوں سے بے نیاز اپنا بناتی وادی و صحرا میں راستا
 کیا خوب جوئے آب ہے مستانہ خوش غرام
 خود سے یگانہ ، سب سے ہے بیگانہ خوش غرام

سب جوئے دشت و مرغ و کہستان و باغ و دراغ بولے کہ "ہو بسطی ز میں تجھ کو سازگار
 ہم کو بنی ہماری تنک آبی سدراہ خود کو بچا تو رنگِ بیاباں سے اے نگار !
 ہر سمت کی ہواؤں پہ سینے کو وا کرے پٹائے سارے ہم سفرانِ زبون و زار
 کیا خوب جوئے آب ہے مستانہ خوش غرام

خود سے یگانہ سب سے ہے بیگانہ خوش غرام
 دریائے پُر خروش نے توڑے تمام بند وادی سے نکلی کوہ و کمر سے گزر گئی
 طے کر کے مثلِ سیلِ نشیب و فراز سب ایوانِ شاہ و کشت و چمن زار روندتی
 پیٹاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار نقشِ کہنِ مناتی اور اپناتی تازگی
 کیا خوب جوئے آب ہے مستانہ خوش غرام
 خود سے یگانہ سب سے ہے بیگانہ خوش غرام

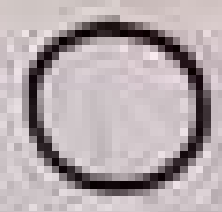


نوٹ: "جوئے آب" گوئے کی مشہور نظم "نغمہ محمد" کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں، جو دیوان مغربی سے بہت پہلے لکھی گئی تھی، المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی، جس کی تکمیل اس سے نہ ہو سکی اس ترجمے سے صرف گوئے کا نقطہ نگاہ دکھانا مقصود ہے۔ (اقبال)

عالم گیر کا خط

(اپنے ایک فرزند کے نام جس نے ان کے مرنے کی دعا کی تھی)

نہ جانا ہے مژداں بڑا پختہ کار
بہت رہ چکے ہیں یہاں سہنیہ چاک
سے جن کے نالے بڑے دردناک
مگر اس کے لب پر نہ اک نالہ آئے
نہ تڑپا وہ رونے سے یعقوب کے
نہیں ہوگا وہ کہنے نخبیر گیر
کبھی تیرے دام دعا میں اسیر



بہشت

عجب کچھ ہے جنت کا بھی روزگار
نہیں درد زنداں کا یوسف کو علم
کہ گردش میں گردون گرداں نہیں
زیخا لئیے قلبِ نالاں نہیں
مقابل نہیں آگ کے داں خلیل
کلیم اس جگہ شعلہ درجاں نہیں
نہیں اس کی کشتی کو صرصر کا خوف
کوئی خطرہ زورِ طوفان نہیں
یقین کی نہیں گھات میں بیم و شک
کوئی وصل کو خوفِ بجاں نہیں
کہاں لذتِ عقلِ آوارہ گام
اگر راہ منزل کی پیچاں نہیں
ہے جنت عجب عالم کورِ ذوق
کہ مژداں ہی مژداں ہے شیطاں نہیں



کشش میر

چلنا ہے کاشمیر کو چل ! کوہ و تل و دمن تو دیکھ
 سبزہ تو دیکھ گام گام ، لالہ چمن چمن تو دیکھ
 بادِ بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
 صلصل و سار زوج زوج برسرِ نارون تو دیکھ !
 تانہ ہو اس کے حسن پر چشمِ سپہرِ لبتہ باز
 روئے زمین پر ذرا برقعِ نسترن تو دیکھ !
 لالہ کھلا ہے خاک سے ، موج رواں ہے آب میں
 خاکِ شرر شرر کہیں آبِ شکن شکن تو دیکھ !
 ساز کو نغمہ ریز کر ، منے سے تو اپنا جام بھر
 قافلہ ، بہار کو انجمن انجمن تو دیکھ !
 بعد میں اپنے آپ پر ایک نگاہِ مختصر
 پھلے تو روئے دل کشِ دخترِ برہمن تو دیکھ !

عشق

جس عقل کا اک جلوہ عالم کو جلا ڈالے !
 وہ عشق ہی سے سیکھے آئینِ جہاں تابی
 یہ عشق ہی ہے جس پر ہر کیفیت آتی ہے
 از تاب و تبِ رومی تا حیرتِ فارابی
 یہ عرف نشاط اور کہہ کہہ کے میں رقصاں ہوں
 دل عشق سے سکھ پائے بائیں ہمہ بے تابی
 ہر معنی پیچیدہ لفظوں میں نہیں کھلتا
 ہاں ڈوب ذرا دل میں شاید ہو سخنِ یابی

بندگی

(عبدالیت)

رات اک میکلے میں بیچ بچہ بادہ فروش
 کہہ رہا تھا کہ مری بات کر آویزہ گوش
 ہے یہی بادہ گساران کہن کا مشرب
 کہ تو مئے خانے سے اٹھا باہمہ مستی ، ہمہ ہوش
 نکتہ شوق بیاں شوق سے کر ، ہونٹ نہ سی ا
 پر نہ دامان ادب چھوٹے ، بن ایسا مئے نوش
 جو ہر ذوق طلب رکھتے ہیں ، ہم گرد راہ
 بندگی دے کے خدائی نہ خرید اے کم کوش

غلامی

آہ ! آدم نے سدا بندگی آدم کی
 اس کو دولت جو ملی نذر قباد و جم کی
 یعنی اس خو میں وہ کتوں سے فروتر نکلا
 سگ کے آگے کبھی سگ نے نہ یوں گردن خم کی !

چیسٹانِ شمشیر

ہے سخت کوش کون جو پتھر سے کھینچے آب
 محتاجِ خضر مثلِ سکندر کبھی نہ ہو !
 مثلِ نگاہِ دیدہ غم ناک پاک رو
 دریا میں دامن اس کا لگے تر کبھی نہ ہو !
 مضمون اس کا ایک ہی مصرع میں ہو تمام
 منت پذیرِ مصرعِ دیگر کبھی نہ ہو

○

جمہوریت

حرفِ بیگانہ کے معنی دوں ہنادوں سے نہ پوچھ
 چیونٹیوں میں شوخیِ طبعِ سلیمانی نہ آئے
 طرزِ جمہوری نہ اپنا ، بن غلامِ پختہ کار
 مغزِ دو صد فر سے ہرگز فکرِ انسانی نہ آئے

○

فرنگستان میں مبلغِ اسلام

سے خطاب

بھڑک اٹھی ہے زمانے میں آتشِ نمرود
کہ آشکار ہو پھر جوہرِ مسلمانی

اب آگِ داغِ جگر سے اٹھائیں سب پردے
کہ آفتاب کی ظاہر ہوئی ہے عریانی

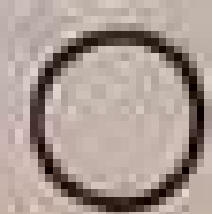
یہ تیری نکتہ فروزی فرنگیوں کے لئے
صنم گداز ہے تیرا یہ علمِ برہانی

پیامِ شہرِ سلمیٰ کادے حجازی کو
شرارِ شوق سے بھڑکا ضمیرِ تورانی

رہ عراق و خراساں لے اے مقامِ شناس
عجم کی بزم میں کر تازہ وہ غزلِ خوانی

کہ زخمِ ورکے ، زمانے سے انتظار میں ہیں
وہ نغمے خوں نہ ہوئے جو بہ سازِ افغانی

سنا نہ اہل ہوس کو حدیثِ عشق و جنوں
نہ چشمِ کور میں بھر سرمہء سلیمانی !



غنی کشمیری

غنی وہ سخن گوئے بلبل صفیر
نوا سنج کشمیر جنت نظیر

ہو گھر میں تو رکھتا مقفل وہ گھر
نکلتا جو گھر سے کھلا رکھتا در

کسی نے کہا " شاعر خوش نوا ا
یہ تیرا طریقہ ہے سب سے جدا

ہوا لب کشایوں وہ مرد فقیر
فقیر اور ہے اقلیم معنی امیر

جو تم دیکھتے ہو یہی ہے روا
کہ میرے سوا گھر میں رکھا ہے کیا

غنی گھر میں جس وقت ہو گوشہ گیر
تو خود ہے متاعِ گرانِ فقیر

وہ جب محفل افروزِ خانہ نہیں
تو خالی پھر ایسا ٹھکانہ نہیں ا

مصطفیٰ کمال پاشا سے خطاب

(جولائی ۱۹۲۲ء)

کسی امی کی یہ حکمت کی تھی تاخیر کہ ہم
 واقفِ سُرِّ ہناں خانہء تقدیر ہوئے
 ہم تو کچھ بھی نہ تھے، جزیکِ شررِ باخترِ رنگ
 کی نظراس نے کہ خورشیدِ جہاں گیر ہوئے
 عشق کا داغ ہی جب پیرِ حرم دھویں بیٹھا
 دہر میں خوار بہ اندازہٴ تقصیر ہوئے
 اپنی فطرت کے موافق تھی ہوائے صحرا
 کھا کے گلشن کی ہوا غنچہٴ دل گیر ہوئے
 غلغلہ وہ جو گیا گنبدِ گردوں سے پرے
 بن گیا نالہ جو پابندِ بم و زیر ہوئے
 تھا کبھی صید، بنا دام نہ کھائے ہی اسیر
 رکھ کے ہم تیروکماں کشتہٴ نچیر ہوئے
 جس طرف راہ ہو، دوڑائے جا گھوڑے اپنے
 مات ہی کھائی ہے جب موردِ تدبیر ہوئے !

طیارہ

مردم کوئی طائر خوش نوا کسی اور طائر سے کہنے لگا
 "مے آدمی کو نہ یہ بال و پر زمیں گیر بن کر رہا عمر بھر
 کہاں میں نے" اے طائر خوش گلو کہوں حرف حق میں تو غم گین نہ ہو
 بنائے ہیں طیارے سے بال و پر نکالی سوئے آسماں رہ گزر
 وہ طیارہ وہ مرغ گردوں سپر فرشتے کے پر سے جو ہے تیز تر
 ہے اڑنے میں شاہیں، بہ طاقت عتاب نظر اس کی لاہور تا قاریاب
 فلک پر خروشیاں ہے اور تند جوش زمیں پر ہے ماہی کی صورت خموش
 خرد، خاک سے ڈھال لے جبریل زمیں سے فلک کی طرف اک دلیل
 سنا مرغ زیرک نے یہ حرف تر کی اک آشنایان مجھ پر نظر
 پروں سے کی منتقار صاف اور کہا "سخن میرا تجھ پر نہیں کھل سکا
 الم نشرح ہیں تجھ پہ سب چون چند ہیں جادو میں تیرے یہ پست و بلند
 "کبھی ٹھیک بھی کار دنیا کیا ؟
 کہ یوں آسمانوں پہ اڑنے لگا ا"
 (سعدی)

عشق

وہ حرف دل فروز کہ راز اب نہیں رہا
 تجھ کو بتاؤں کس کو یہ کس نے سنا دیا
 شبنم نے آسماں سے سنا گل سے کہہ دیا
 بلبل نے گل سے سن کے صبا کو بتا دیا

سَنَابَتِي

مئے باقی

(۱)

بہاروں نے سجائی آکے بزمِ نعمتگی ایسی
نوا بلبل کی سن کر آنکھ غنچوں نے بھی وا کر دی

گماں مت کر ازل میں ڈھل چکی ہے اپنی یہ مٹی
وجودی بحر میں ہم ہیں کوئی موجِ خیال اب بھی !

نہ کریوں علم پر غزۂ ہے کارمئے کشتی شئے اور
فقیرِ شہر کی ہے آستیں بھی تر ، گریباں بھی !

بہاروں نے کیئے بکھرے ہوئے سب برگِ گل یک جا
نگاہوں سے ہماری رنگِ آب و گل میں افزونی

جو اپنے پر نظر رکھے ، نشاں اس کا ہے بس اتنا
کہ کرتا ہی نہیں وہ بات غائب کی ، نہ حاضر کی

کہا کیا خوب پیرِ زندہ دل نے میکدے میں کل
کہ ابراہیم بھی ہر دور میں ہیں اور آزر بھی

بنائے آہ ! کیا کیا نقش میں نے بزمِ ہستی میں
بہنیں تھا ، جس کو ہونا تھا اور انہونی ہوئی ہونی

کر اہل دیر سے نرمی کہ ہے عشقِ غیور ایسا
بنائے بشکدہ رکھتا ہے قلبِ غزنوی میں بھی

نہ ہوگا مردہ زندہ نغمہ دواذ سے جیسے
بہ خاک ہند اثر سے سے نوائے زندگی خالی

حلقہ گیر آج ہیں تربت چہ مری نوحہ گراں
دلبراں ، زہرہ و شاں ، گلبدناں ، سیم براں
باغ میں قافلہ لالہ و گل اتر ہے
دیکھو تو آئے کہاں سے ہیں یہ خونیں جگراں
ڈھونڈتا کیا ہے سر مدرسہ تو دانش و ذوق
مئے ملے گی نہ سر کارگہر شمشیر گراں
خرد افزا تھے مجھے درس حکیمانِ فرنگ
سینہ افروز ہوئی صحبتِ صاحبِ نظراں
چھیڑ وہ گیت جو اٹھے تری آب و گل سے
اے زخود رفتہ اتھی ہو ز نوائے دگراں
کس کو معلوم کہ ہے میری بھی قیمت کوئی
ہوں وہ دولت کہ ہوئی دست زدِ بے بصراں

فکر میری ہر زمانے میں تراشے بت نئے
آپھننے اک بند میں ، گر ہو رہا اک بند سے
برسرِ بام آا الٹ کر اپنے چہرے سے نقاب
آرزو مند اور کوئی مجھے سا شاید ہی ملے
مجھ کو اپنے دیدہ بینا سے خود غیرت سی آئے
پردہ اس رخ پر کروں اپنی نگاہِ شوق سے
اک نگہ ، اک خندہِ زردیدہ ، اک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت اب قسم کیا چلے

عشق پر نازاں ہوں ، جس نے اضطرابِ بحر میں
 جاں سے تیرے درد کے پیوند باندھے نت نئے
 نالہ بے باک تر کی خاطر اے مرغِ بہار
 لے! حریمِ سمیخہ سے میرے ذرا سی آگ لے !
 چنگِ تیموری گیا ، آہنگِ تیموری رہا
 سن ذرا ، اب اک نیا سازِ سمرقندی بے !
 رہ نہ دے کعبے میں اے پیرِ حرمِ اقبال کو
 ہر زمانے میں ہیں اس کی آستین میں بت نئے

(۳)

شکایت ہے مجھے اس دیدہٴ بینی سے بس اتنی
 کہ جب تو جلوہ آرا ہو بنے پردہ نظر میری !
 ذرا مجھ پابِ گل کا یہ پیام ان نوریوں کو دو
 حذر اس خاکِ پیکر سے رہے جو نحوِ خود بینی !
 نوا پیرا ہیں اور بزمِ بہاراں میں ہیں سوزاں ہم
 جلاتی ہے ہمارے بال و پر آہِ سحر گاہی
 وہ کچھے کیا نوا میری جو ہونا آشنا خود سے
 جہاں ہے دوسرا میرا تو دنیا دوسری اس کی !

مثال لالہ اک گلشن کے گوشے میں پڑا ہوں میں
کہ تاکا ہے جگر میرا، نظر کے تیر نے اس کی

جفاؤں کے تعاقب ہی میں تو جیتے ہیں زندہ دل
نہ تھا اس راہ میں خطرہ، نہیں لی راہ کعبے کی

ہزاروں محفلیں آراستہ کیں، پھر کیا برہم
قمر کی شمع سے روشن سرائے ہے یہ ایسی ہی!

خود اپنی خاک سے تعمیر کر اک آدم نو کی
شرر کے اک تبسم کی طرح فرصت ہے یاں تھوڑی

ہنہیں ہے بواہوس گرتو تو اک نکتہ کہوں گا میں
اگر ہوں بے اثرنالے تو ہوگا عشق پختہ بھی

عجم نے میرے نغموں سے پرانی آگ کی روشن
عرب ہے بے خبر میری نواؤں سے مگر اب بھی!

(۵)

میں تو اسی بہانے ہوا ہوں غزل سزا
محرم ملے تو دوں کوئی پیغام آشنا

خلوت میں ہے سخن بھی بڑا پردہ حجاب
آنکھوں سے دل کی بات سنانا مجھے پڑا

کرتا ہوں دھوکے پاک نگہ جوئے اشک میں
یعنی ہے تیری دید کا درپیش مرحلہ

غنچے کی طرح کام میں میرے گرہ پڑی
میں شوقِ آفتاب میں ہر لمحہ کھل اٹھا

اس بحر میں ہوں میں تو بھلے یہ گماں نہ کر
رہتا ہوں میں سدا کسی ساحل کو ڈھونڈتا

پروا نہیں ہے سیل کی مجھ کو کوئی کہ خود
ہوں مسلِ موج سازِ وجود ایک بحر کا

ہے دیدہ و نظر سا مرا اور اس کا ربط
میں اس سے لاکھ دور رہوں ، اس کا ہوں سدا

نقشِ جہاں یہ پردہ بنا میری آنکھ کا
جادو کا اس کے میں بھی گرفتار ہو گیا

گنبد یہ ، جس کے بند ہیں در ، کیا سماؤں میں
میں پہلوئے فلک میں کھٹکتا ہوں خار سا

پرواز مجھ کو رکنے نہ دے آشیانے میں
گہ شاخ پر تو گاہ لبِ جو ہوں گھومتا

(۶)

پردگیانِ ساز کے رخ سے نقاب رخ اٹھا
مرغِ نوا طراز کو گیت نئے نئے سکھا

راہروں کے خون سے راہ، موسم گل میں فرش گل
 قافلہ نیاز کو لوٹے، یہ کس کا ناز تھا !
 دیدۂ خواب ناک اگر اس نے کیا چمن پہ وا
 زکس نیم باز کو ذوقِ نظر بھی کر عطا
 خلوتیانِ راز سے کہنا کہ بچے بچے کی
 آج زباں پہ آگیا حرفِ نکتہ آپ کا
 لوگوں کے سامنے نماز پڑھ جو رہا ہے تو طویل
 خود دلِ کافراں میں ہے اس سے فروش اک بپا
 لے کے میں تختِ جم نہ دوں آہِ جگر گداز کو
 گرچہ نگاہِ عقل میں عشق ہے چیز کم بہا
 کہتا تھا برہمن " یہ ہے میرا چرتر غزنوی
 توڑ دیئے بت اور خود داس بنا ایاز کا "

(۷)

یہ ملازمانِ سلطان کو بتادے کوئی اتنا
 کہ نوائے دل گداز اک کرے زیر ایک دنیا
 نہ ہو اپنے دھن پہ نازاں کہ بہ شہرِ درد منداں
 ہے تبسمِ ایازی دلِ غزنوی سے مہنگا
 دلِ شاہ اس کو دیکھے تو لرز لرز ہی اٹھے
 دلِ بے نیاز ایسا ہے گدائے بے نوا کا

کہ دیا اسے خدا نے یہی نازِ بے نیازی
یہی سازِ بے نوائی ہے متاعِ اس کی اعلا

یہ بلند و پست رہ کے ، مجھے سب میں ایک جیسے
میں طلسمِ دل کا قیدی ، نہ مقام پوچھ میرا

ہے نگاہِ پاک تیری ، جو نیاز مند ہے دل
تو رسائی تیری ہوگی ، رہِ عاقلی سے باز آ !

تیری چشمِ کم ہے اور تو ، مری جاں سلگتی اور میں
تری راہ میں بھٹکتا ، تری بے رخی کا مارا

وہ نگہِ نشانہ ڈھونڈے ، مرا دل بہانہ ڈھونڈے
کہ نیاز و ناز دونوں ہیں عجب ستیزہ آرا !

رہِ دیرتختہ گل مرے سجدہٴ جبہیں سے
کہ دو رکعتوں میں پائے نہ سکوں نیاز میرا

(۸)

ساقیِ لالہ رخ دست بر چنگ ہے
باغِ خجالتِ وہ فنِ ارژنگ ہے

لالہ خون بہاراں سے مہندی رچائے
 یہ دلہن کس قدر تشنہ رنگ ہے
 نغمہ دل فروز آنکھ پر کھول دے
 جس معانی پہ راہِ سخن تنگ ہے
 عشق کی آنکھ سے لے سراغ اس کا تو
 عقل پر یہ جہاں بحر و نیرنگ ہے
 عشق سے سیکھ عمل اور چاہے جو کر
 جوہر ہوش وہ جانِ فرہنگ ہے
 تیرا میرا فلک سے ہے آگے مقام
 سورج اس راہ میں میلِ فرسنگ ہے
 خود کو کھویا ہوا قطرہ بے آس تو
 بحر میں رہ کے گوہر نہ ہو، ننگ ہے !
 قدر اپنی تو کر تجھ سے اس کی بہا
 لعلِ رخشندہ تو پارۂ سنگ ہے

(۹)

پوجا پاٹ نہ کی صورت کی، یہ بت خانہ ڈھایا میں نے
 میں ہوں سیلِ سبک سیر ایسا، ہر اک بند ڈھایا میں نے
 میرے بود و نبود میں اندیشے نے گماں کے پرے جمائے
 عشق سے میں ہوں، ہوا ہویدا، عشق سے راز یہ پایا میں نے

دیر میں نازو نیلز ہے میرا اور کعبے میں مری نمازیں
 ہاتھ میں اک تسبیح کو تھاما اور زناں گھمایا میں نے
 تیرے درد کے سرمائے کو غارت کرنا ٹھیک نہیں ہے
 دل سے جو بھی آنسو ادا، آنکھوں ہی میں چھپایا میں نے
 فرزانہ گفتار سے اپنی اور عمل سے دیوانہ ہوں
 مستی میں ہشیار ہوں، ایسا بادۂ شوق چرمھایا میں نے

(۱۰)

گلستاں کو بہاروں نے بنا ڈالا ہے مئے خانہ
 سبو غنچے سے ڈھالا اور بنایا گل سے پیمانہ
 محبت جب ہوئی کامل، رقابت ہوگئی زایل
 فدا ہے شمع پر مل جل کے پروانے سے پروانہ
 غضب کا سوز اگر دیکھیں تو ساز زندگی میں ہے
 جلا کر پھونک بھی دیتی ہے بیدردانہ، کاشانہ
 ہے اس کے سوز میں لیکن بلا کا ساز بھی پہناں
 بدل دیتی ہے کاشانے میں پل کی پل میں ویرانہ
 چکوروں کے پروں کے سائے سے بھی وہ لرز اٹھے
 قفس میں جب بھی شاہیں ہو چلے منت کشِ دانہ
 بس اب اے باغباں اقبال کو گلشن سے رخصت کر
 کہ یہ جادو نوا گل سے ہمیں کرتا ہے بیگانہ

(۱۱)

میرا سلام کہیو اس ترکِ مندِ خو کو
پھونکا نظر سے جس نے اک شہرِ آرزو کو

اک درد مند دل ہی شاید یہ نکتہ سمجھے
گو میں نے کر لی توبہ ، توڑا ہمیں سہو کو

اس کی وفا کا قصہ کب تک سناؤں بلبل
آغوش میں بھرے تو پھر اس رمیدہ بو کو

رمزِ حیات کیا ہے ، ہے سوزیا تڑپ ہے
قلزم سے جا کے ملنا ہے ننگِ آبجو کو

خوش ہوں کہ عاشقوں کو سوزِ دوام بخشا
درماں نہ کوئی بخشا آزارِ جستجو کو

بولے نہ یوں ورے ہو ، ہٹ دور اب پرے ہو
بخشا نیا بہانہ اشکِ بہانہ جو کو

نالوں سے گلستاں میں آشوبِ حشر اٹھا دے
جب تک کہ دم میں دم ہے ، مت چھوڑ ہائے وہو کو

(۱۲)

ہمارے قصے سے کانٹے کانٹے کو تونے یاں آشنا کیا ہے
جنوں کے صحرا میں ہم کو پہونچا کے اور رسوا رسوا کیا ہے

ہماری تقصیر ایک دانہ ، تو جرم اس کا تھا ایک جگہ
 نہ اس بچارے سے ہی نبھائی ، نہ کچھ ہمارا بھلا کیا ہے
 اُگے ہیں کشتِ خیال سے میری سو جہاں مثل لالہ و گل
 یہ اک جہاں ا سو بھی کر کے خونِ تمنا آخر یہ کیا کیا ہے
 یہ پرتوِ حسن تیرا ابھرا ہوا ہے مانندِ رنگِ ہر سو
 مثالِ بینائے مئے یہ پردہ عجیب دیوار کا کیا ہے
 نئی طرح رکھ کوئی یہاں پر کہ ہم ہیں جدت پسند تھوڑے
 کہ آج اور کل کا تو نے حیرت کدہ یہ کیسا کھڑا کیا ہے

(۱۳)

خوشا کہ رختِ فرد کو جس نے جلادیا شعلہ ہائے مئے سے
 مثالِ لالہ اس آگ ہی کو متاع و نقدِ حیات کر لے
 اٹھا اٹھا تو بھی ساغرِ مئے اور اپنے چہرے کو گلستانِ کر
 بہار نے صوفیوں کو فرقہ فروشی اب تو سکھا ہی دی ہے
 مرا فقیہہ حرم کی محرومیوں پہ دل آج کڑھ رہا ہے
 کہ پیرِ مئے خانہ اس کے فتوے کے بدلے اپنا نہ جام بیچے
 مری نوابائے بے اثر سے نہ ہوگی قدرِ سرود کچھ کم
 ہے برقِ نغمہ وہ شئے کہ جس سے متاعِ اسکندری جل اٹھے
 صبا ذرا گلستانِ دیر میں جا کے میرا سلام کہنا
 کہ خاک اس کی ہے وہ کہ روشن ہے چشمِ نکتہ وراں اسی سے

(۱۴)

اٹھا ساغر کہ اب گردشِ فلک کی حسبِ مرضی ہے
 مثالِ غنچہ گلشن میں نوا شاخوں میں اگتی ہے
 پیوں شیخِ حرم کی میں تنک نوشی کو کر کے یاد !
 کہ جس نے پی تو اپنے رازداں کے ساتھ ہی پی ہے
 بڑھے اس کا قبیلہ جو یہ حرفِ پختہ کہتا ہے
 چراغِ امید ہی کا شمعِ راہِ زندگانی ہے
 غزل میں نے وہاں چھیڑی جہاں سنتا ہنیں کوئی
 نوا یہ ، دوستوں کے حوصلے سے ، میری اونچی ہے
 غیارِ معرفت ہے مشتری کی ، یہ سخنِ سخی
 متاعِ کس مسخر ٹھہری ، خوشی مجھ کو اسی کی ہے
 یہ شعرِ دل کشِ اقبال سے ثابت ہوا آخر
 کہ درسِ فلسفہ دیتے ہوئے بھی عاشقی کی ہے

(۱۵)

آرزو مجھ کو ہے شمشیر و سنان و تیر کی
 ساتھ مت آ ! دُھن ہے مجھ کو مسلکِ شبیر کی

کر رہا ہوں جمع تنکے آشیانے کے لیے
 اور تمنا ہے شرارہ ہائے آتش گیر کی
 کہہ رہے ہیں فاش مت کر راز میرے ، ہونٹ سی
 میں کہوں ، ہے آرزو بس نعرۂ تکبیر کی
 کہہ رہے ہیں ، جو بھی تیرے دل میں ہے وہ کر طلب
 بے حجابی چاہتا ہوں میں فقط تقدیر کی
 اس قدر ہی جانتا ہوں میں تو اپنا روزگار
 بھول بیٹھا خواب لیکن دُھن لگی تعبیر کی
 وہ نگاہ ناز جس نے دل اڑایا ، ہے کہاں
 لمبی اس کی عمر ہو ! حسرت ہے اس کے تیر کی !

(۱۶)

لے بس ہاتھ میں اور زنار باندھنا سیکھ
 تیری نظر دوہیں ہے تو پھر نہ دیکھنا سیکھ
 مثلِ شمیم باہر آ ! گل کی خلوتوں سے
 موجِ صبا کے ہمراہ گلشن میں گھومنا سیکھ
 شبنم کا ایک قطرہ بے مایہ ہے اگر تو
 اٹھ ! اور داغِ دل پر لالے کے بیٹھنا سیکھ

تو گل کے ساتھ کوئی کانٹا اگر بنا ہے
 عزت چمن کی رکھ لے ا یونہی گزارنا سیکھ ا
 گر باغباں چمن سے تجھ کو اکھاڑ پھینکے
 سبزے کی طرح پھر سے سر کو ابھارنا سیکھ
 ہو تاکہ تو شراب سوزندہ ، تلخ تر بھی
 عزت میں خم کدے کی خود کو نکھارنا سیکھ
 کیا دوسرے کے بل پر یہ اڑنا ، پھڑ پھڑانا
 گزار کی ہوا میں آزاد گھومنا سیکھ
 بت خانہ کھٹکٹایا تو مرغ بچے یہ بولے
 تپ کر حرم کے اندر شعلے ابھارنا سیکھ ا

(۱۷)

ہے تیری خاک میں جو گم طلب وہ آگ بھی کر ا
 نہیں تقاضے کے قابل تجلی دیگر
 رکھے نہ جان ہتھیلی پہ جو ، وہ ہم سے نہیں
 نہ دوں یہ مصرع نظیری کا ، ملکِ جم لے کر
 تو دل گرفتہ نہ ہونا کہ عشق اکیلا نہیں
 اگرچہ عقل فسوں پیشہ لائی ہے لشکر
 تو رہ شناس نہیں ، بربطِ سلیمی میں
 ہر ایک نغمہ ہے ، تجھ کو نہیں ہے اس کی خبر

جہاں میں پھیل گئے جلوہ ہائے دوست مگر
میں خود کو دیکھ رہا ہوں ، ہٹاؤں کیسے نظر

اب آگے غلغلہ اک شہرِ دلبراں میں اٹھائیں
جنوں ہمارا ہنہیں ہرزہ گردِ دشت و در

سنا حکایتِ صیدِ ہننگ اور نہ کہہ
ہنہیں سفینہ مرا روشناس بحر ، مگر ا

غلام اس کا ہوں میں ، جس نے وہ سفر نہ کیا
کہ جس سفر میں ہنہیں کوہ و دشت و بحر و بر

شریکِ حلقہء زندان بادہ پیما ہو — ا
جو مردِ غوغا ہنہیں اس سے اے عزیزِ حذر ا

برسہٴ حرف نہ کہنا ہے گفتگو کا کمال
مدارِ خلوتیوں کا ہے رمز و ایما پر

(۱۸)

موج کو بھی اک دریا کے سینے سے نکالا جاسکتا ہے
بحرِ بے پایاں کو ندی میں اپنی باندھا جاسکتا ہے

سوزِ نوا سے شہرِ دل میں خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں
موجِ نسیم سے ایک "چمن گل" ، سینہٴ چیرا جاسکتا ہے

سدھی ہوئی چڑیا کی طرح جبریل کو بس میں کر سکتے ہیں
 جلے ہوئے اک بال سے اس کا شہر باندھا جاسکتا ہے
 جامِ جم سے نازک تر ہے کارِ سلطنت اے اسکندر !
 ایک جہاں آئینہ اک پتھر سے توڑا جاسکتا ہے !
 تو ہو اگر محکم تو سیلِ بلا انگیز نہیں ہے کچھ بھی
 مثلِ گوہر دریا کے دل میں بھی بیٹھا جاسکتا ہے
 میں ہوں فقیر بے نیاز اک ، میرا مشرب ہے بس اتنا
 مومیائی تو نہیں ہے ممکن ، لیکن ٹوٹا جاسکتا ہے

(۱۹)

تو نالہ شب گیر کہ تو صبح بلا خیز
 تو آہِ شرر ریز اور اک شعرِ دل آویز
 کیا فرق ہے ، معلوم ہے کچھ عشق و ہوس میں ؟
 وہ تیشہ فریاد ہے یہ حلیہ پرویز
 کہہ دو کوئی ان پردگیوں سے ، مری مٹی
 اک گردِ نظر باز ہے ، اک خاکِ بلا خیز
 سرمست کرے مجھ کو ، مرے ہوش اڑائے
 مرغانِ بحر خیز کی گلبنگِ دل آویز
 ڈرتا ہوں نہ پھر خاکِ سمرقند سے اٹھے
 آشوبِ ہلاکو ، کوئی ہنگامہ چنگیز

مطرب کوئی رومی کی غزل چھیڑ ، کوئی شعر — ا
تا حلقے میں لے جاں کو مری آتشِ تبریز — ا

(۲۰)

چشمِ کرشمہ ساز کو سرے سے کر جگر جگر
شوقِ غزلِ سرائی کا ذوقِ جنوں دوچند کر
خاک کا پتلا ڈھالنا ، زیبِ ذرا تجھے نہ دے
نقشِ اک اور اے خدا ، آدمِ اک اور پختہ تر
لذتِ ہائے ہائے کا خلوتیو ! کروں میں کیا
کننے کا دردِ دل نہیں ، دردِ جگرِ حجابِ اثر
آہِ درونہ تابِ لاؤ ، اشکِ جگرِ گدازِ لاؤ
عقلِ گرہ کشا کا جام توڑ رہا ہوں سنگِ پر
جام اٹھا ، غزلِ سنا ، بندقبا کے کھول دے
زخمے سے تارچنگ چھیڑ ، باغ میں چل کے خیمہ کر
صبح ہوئی تو کارواں پڑھ کے نماز چل پڑا
زمزمہ درا ابھی تو نے سنا نہیں مگر ا
نازِ شہاں اٹھاؤں میں ، زخمِ کرم نہ کھاؤں میں !
دیکھ تو اے ہوس فریب ! کرمے ہوس پر نظر ا

ہے عقل مکر باز کا انداز دیدنی
کرتی ہے میرے قافلہ ہو کر بھی رہزنی

رکھ عقل حیلہ گر سے نہ امید رہمنائی
آ ! عشق باکمال ہے اور وہ بھی یک فنی

کرتا ہے گو فرنگ ستاروں سے گفتگو
بچ کر نکل کہ اس کا ہے شیوہ ہی جوزنی

کیا اس سرائے کہنہ میں ہو ذکر مرگ و زیست
ہے زیست ایک کاہش جاں ، مرگ جاں کنی

پل بھر سرمزار شہیداں پہ بھی ٹھہر
اس خاموشی میں کبھی ہے ہناں حرف گفتنی

دشتِ عرب کی راہ پکڑ ، چھوڑ عجم کی بزم
فرسودہ اس کی مئے ہے تو ساغر شکستی

اقبال شیخ شہر نہ شاعر نہ فرقہ پوش
اک رہ نشیں فقیر ہے ، دل کا مگر غنی !

حسرت ہے مجھ کو جلوہ و ماہ تمام کی
سینے پہ ہاتھ اور نظر بام پر مری — !

کہتا ہے حسن ، شام نہیں میری صبح کی
اور عشق کو ملی ہے تب و تابِ دائمی

امروز میں ہوں قید نہ فردانہ دوش میں
 پست و بلند ہے نہ اسیری مقام کی
 رازوں بھری شراب ہوں، ہے کوئی میگسار ؟
 گردش شراب خانے میں جاری ہے جام کی
 لاہوتی اس نوا سے نہ جا بن کے بے نیاز
 پیغامِ دوست رکھتا ہوں اک اپنے پاس بھی
 ہوں پردہ در ، چہ رکھتا ہوں پردہ سخن کا میں
 ہے تیغِ خون فشاں مری زینت نیام کی

(۲۳)

ہماری شاخِ زندگی میں تشنگی سے ہے نئی
 دلیلِ ناتمامی ہے ، تلاشِ آبِ خضر کی
 حدیثِ دل کے سناؤں ، کون راہ جاؤں میں ؟
 کہ آہ ہے تو بے اثر ، نظر ، ادب سے دشمنی
 غزل سرا تو ہو مگر سُروں کو اپنے پست رکھ
 کہ نالہ طیور ہے نوائے زیر لب ابھی
 حجاز والے لے اڑے متاعِ قافلہ اگر
 تو تم زباں نہ کھولنا کہ ہیں تو پھر وہ اپنے ہی !
 ظہورِ مصطفائی کو بنا بہانہ بوہب
 ہے شاخِ ترک ، برق سے فرنگ کی ہری بھری

عجم کی محک پر پرکھ ، نہ رکھ ، عیارِ ہند پر
 کہ گریہ ہائے نیم شب کی دین ہے یہ شاعری
 کشید کی ہوئی ہے یہ تو خم سے پیر روم کے
 کہ بادۂ عنب سے تیز ہے مئے سخن مری !

(۲۳)

عاشق کے لئے ہے اک ، کعبہ ہو کہ بت خانہ
 یہ جلوتِ جانانہ ، وہ خلوتِ جانانہ

خوش ہوں کہ مرا مرقدیاں کوئے حرم میں ہے
 پلکوں سے بناؤں گا رہ اب سوئے بت خانہ

سو بزم جہاں کیا شئے ؟ یہ حورو جنناں کیا ہے
 اک ہمدمِ فرزانه دو بادۂ و پیمانہ

ہر اک کی نظر اپنی ، ہر اک کی زباں اپنی
 اٹھا تری محفل میں افسانے سے افسانہ

شب خون دلوں پر یوں کس شخص نے مارا ہے
 صد شہرِ تمنا پر یہ حملۂ ترکانہ

اس دشت جنوں میں تو جبریل ہے پہلے ہی
 اک صیدزبوں میرا ، اے ہمدمِ فرزانه

بڑاں پہ کسند اپنی اب پھینک رہا ہوں میں
 اے ہمتِ مردانہ ، اے ہمتِ مردانہ !

اقبال نے کہہ ڈالے سب راز نہ کہنے کے
مئے خانے سے نکلا ہے ناپختہ یہ دیوانہ

(۲۵)

تیرے بغیر تو خواب عدم سے باہر آنا ، ناممکن ہے
تیرے ساتھ نہ جینا یعنی تجھ بن جینا ، ناممکن ہے
دل میں ہمارے ہے یہ جہاں یا جہاں میں یہ دل کھویا ہے
لب سی بیٹھو ! یہ پیچیدہ کتھی کھلنا ، ناممکن ہے

دل یاروں کے میری نوائے پریشاں سے ہیں سوزاں سوزاں
لیکن میں اس گیت سے تپتا ہوں کہ سنانا ، ناممکن ہے

بادِ صبا ! اس تیری تنک افشانی شبنم سے کیا ہوگا
تاب و تاب لالے کے جگر کی ٹھنڈی ہونا ناممکن ہے

دل کو حق سے باندھ ، کشاد اپنی نہ طلب کر شاہوں سے تو
یعنی اس بت خانے کے درپر سر کو جھکانا ، ناممکن ہے

(۲۶)

یہ گنبدِ مینائی یہ پستی و بالائی — !
گم ہیں دل عاشق میں ، بائیں ہر پہنائی

اسرارِ ازل ڈھونڈے ؟ ڈال ایک نظر خود پر
یکتائی و بسیاری ، پہنائی و پیدائی

اے جانِ عزیز دیکھا کیا چیزِ محبت ہے
سینے میں نہ چین آیا ، آنکھوں سے نکل آئی

اٹھ ! باد بہاراں نے کی مشعلِ گلِ روشن
کر لالہء صحرائی سے کچھ تو شناسائی

عشق اور ہزار افسوں ، حسن اور ہزار آئیں
گنتی میں نہ تو آئے ، گنتی نہ مری آئی

ہے اوجِ ثریا بھی ، اور قعرِ مذلت بھی
خاقانی و فغوری ، جمشیدی و دارائی

(۲۷)

(ایک صوفی کے نام)

ہوس منزلِ لبائی نہ تو رکھے ہے نہ میں
جگرِ گرمیِ صحرا نہ تو رکھے ہے نہ میں

پیرمے خانہ ہے تو اور جواں ساقی میں
بزم ہے تشنہ کہ صہبا نہ تو رکھے ہے نہ میں

دل و دویں لوٹ چکے زہرہ و شانِ عجمی
آتشِ شوقِ سلیمی نہ تو رکھے ہے نہ میں

صرف چنتے تھے صدفِ ساحلِ دریا پر ہم
دانہ گوہرِ یکتا نہ تو رکھے ہے نہ میں

چھوڑ اب یوسفِ گم گشتہ کی کیا بات کریں
تمشِ خونِ زلیخا نہ تو رکھے ہے نہ میں

آ چراغِ تہہ داماں ہی سے اب ساز کریں
طاقتِ جلوۂ سینا نہ تو رکھے ہے نہ میں

(۲۸)

میں منزل آشنا ہوں ، تھام دامن میرا دیوانے
شرارِ شوقِ مجھ سے لے کر اپنی خاک میں رکھ لے ا

عروسِ لالہ نکلی ہے سرانے ناز سے باہر
تری جاں پھونک دوں میں حرفِ شوقِ انگیز سے اپنے ا

غمِ فرہاد کا یا عشرتِ پرویز کا قصہ
کہا جاتا ہے ہر اک دور میں اسلوبِ تازہ سے

اگرچہ کافرہندی ہوں ، میری آنکھ روشن ہے
بخارا ، کابل اور تبریذ کی خاکِ مقدس سے

(۲۹)

رونا ہمارا بے اثر ، نالے ہمارے نارسا
حاصل ہے سوزوساز کا بس اک دلِ خونیں نوا

دیکھی جو اس دل کی تڑپ ، دیر و حرم پیدا کئیے
اس کی تمنا ہے مجھے ، محوِ تماشا وہ مرا

ہیں پردہ داراں بے حجاب ، اپنی خودی میں غرق میں
اور عشقِ غیرت مند کو میلِ تماشا لاسپے

مطرب نے مئے خانے میں کل کیا خوب نکتہ کہہ دیا
گوئے چشی ہے اک خطا ہے مئے کشی تاہم روا

سب رہروں کی زندگی کیا ہے فقط جہد و عمل
اس قافلے کو موج کے ، جاوہ کہاں ، منزل کجا

میری خس و خاشاک میں بھڑکا کے شعلے رکھ دیے
روئی نے جب یہ کہہ دیا - منزل ہماری کبریا

(۳۰)

ہماری دنیائے دل میں پیدا تو کوئی دورِ قمر نہیں ہے
 ہے ہر دم اک انقلاب لیکن وہاں یہ شام و سحر نہیں ہے
 مجھے ہے دکھ ایسے قافلے کا کہ جس نے دوں ہمتی سے اپنی
 طلب کی اک رہ گزار ایسی کہ جس میں کوئی خطر نہیں ہے
 فرد سے دامن کشاں ہو اور بحر عشق کی موج میں ہو غلطان
 کہ اس تنک مایہ آبجو میں نہیں ہے کوئی گہر نہیں ہے
 جو تیرے میرے خیال کی پے پے تگ و تاز کا ہے مقصود
 وہ آنکھ میں ہے مگر ہو یدا کہیں مثالِ نظر نہیں ہے

(۳۱)

ہے سوزِ سخن نالہ مستانہ دل سے
 یہ شمع ہے روشن اسی پروانہ دل سے
 اک مشتِ گل اور ذوقِ فغاں ؟ یہ نہیں ممکن
 غوغا ہے یہ سب گردشِ پیمانہ دل سے
 سیارہ یہ تاریک جہاں نام ہے جس کا
 فرسودہ یہ پیکر ہے صنم خانہ دل سے
 تکتا ہے ستارے جو رصدگاہ میں بیٹھا
 کچھ دور نہیں سِردِ ویرانہ دل سے

افلاک کے نوری ہیں اسیر اس کی نظر کے
صوفی ہے فنا شیوۃ ترکانہ دل سے
محمود ہوا ، ڈھایا صنم خانوں کو جس نے
سجادِ بتاں فیضِ صنم خانہ دل سے
غافل کوئی ایسا بھی مسلمان نہ ہوگا
دل رکھ کے ہو ، منجملہ بیگانہ دل سے

(۳۲)

سطوت کوہ سے لے کر برگِ کاہ کو بخشا کرتے ہیں
جمشیدوں کے تاج گدائے راہ کو بخشا کرتے ہیں
عشق کی راہ میں کوئی فلاں اور ابن فلاں کچھ چیز نہیں
موسىٰ کا ید بیضا مردِ سیاہ کو بخشا کرتے ہیں
تختِ شاہ کبھی سلطان کے تختِ جگر کو بھی نہیں ملتا
کبھی یہ ہوتا ہے ، زندانی چاہ کو بخشا کرتے ہیں
فقر کو ہوجاتی ہے جہاں بانی و جہاں گیری بھی عطا
سیخِ نگاہ اک ایسی گدائے راہ کو بخشا کرتے ہیں
عشق ہوا پامال خرد اور جہاں دگرگوں ایسے میں
رخصت آہ کی مجھ سے فقیر راہ کو بخشا کرتے ہیں

(۳۳)

حرم میں تو سمائے نے سوئے بت خانہ آتا ہے
 پہ مشاقوں کے دل میں کیا ہی مشتاقانہ آتا ہے
 حرم جان مشاقاں میں آجا ! بے جھجک آجا !
 تو صاحب خانہ ہے آخر یہ کیوں وزدانہ آتا ہے
 کبھی کرتا ہے غارت دولتیں تسبیح خوانوں کی
 کبھی زناریوں کو لوٹنے ترکانہ آتا ہے
 پہاتا ہے کبھی اپنوں کا خون لشکر کشی کر کے
 کبھی محفل میں لے کر شیشہ و پیمانہ آتا ہے
 کبھی تو نخل سینا کو جلائے بے محابانہ
 کبھی شمع یتیمیاں پر تو ، بن پروانہ آتا ہے
 ادھر آ ! اک خمستان خودی سے جام بھر اقبال
 کہ تو مغرب سے اپنے آپ سے بیگانہ آتا ہے

(۳۴)

چمک دمک بتکدہ عجم کی پہونچے نہ سوزوگداز کو میرے
 ایک نگاہِ محمدِ عربی چھین چکی ہے حجاز کو میرے
 عقلِ بہانہ جو ، میں کروں کیا ، لگائے ہر دم گرہ گرہ پر
 ایک نگاہ ! کہ گردشِ چشم یہ ڈھائے طلسمِ مجاز کو میرے
 میرے دلِ زندہ کی تپش تک پہونچے خرد کی فسوں گری کیا
 درسِ فلسفہ چھوڑ ! اپنالے مسلکِ سوزوگداز کو میرے

(۳۵)

مثل آئینہ نہ ہو محوِ جمال اوروں کا
 دیدہ دل سے مٹا ڈال ! خیال اوروں کا
 پھونک دے آتشِ مرغانِ حرم سے اس کو
 آشیانہ کہ جو تیرا ہے ، ہنال اوروں کا
 تجھ کو اڑنا ہے تو پھر اپنے پرو بال سے اڑ
 اڑنا ممکن نہیں کر ہو پروبال اوروں کا
 مردِ آزاد ہوں میں اور ہوں غیور اتنا
 مری جاؤں جو ملے جامِ زلال اوروں کا
 تو کہ ہے جاں سے بھی نزدیک پہ نظروں سے ہناں
 بجز پیارا ترا ، چاہوں نہ وصال اوروں کا

(۳۶)

جہانِ عشق نہ رمیری نہ سروری جانے
 یہی بہت ہے کہ آئینِ چاکری جانے
 ہنسی ضرور جو بھینے جھینو ، پھیرے لگائے
 ضمِ پرستی و آدابِ کافری جانے
 یہاں ہیں خیر و اذر بہت ، ضرور ہنسی
 کہ جو بھی نانِ جویں کھائے حیدری جانے

ہے چشمِ اہلِ نظر میں بڑا سکندر سے
گدائے رہ جو مالِ سکندری جانے

اسی سے مل کہ حسیں تر ہے خوب رویوں سے
وہ مردِ پیر جو آئینِ دلبری جانے

فرنگِ شیشہ گری کر کے ڈھالے ساغر و جام
مزه یہ ہے کہ وہ شیشے ہی کو پری جانے

فسانہ یہ ہے مسلمان نا مسلمان کا
کہ ہے وہ پورِ خلیل اور آذری جانے

کبھی ہو تیرا گذر میرے غم کدے سے تو دیکھ !
ساترہ سوختہ یہ ، کیمیا گری جانے

کبھی تو مجلسِ اقبال میں بھی بیٹھ کے پی !
اگرچہ سر نہ تراشے ، قلندری جانے

(۳۷)

ہر خواجہ ہے بندے کی طرح اس کا پرستار

ہر بندہ ہے خواجہ کی طرح اس کا خریدار

واعظ کا بیاں طور و تجلی سے ہے معمور

جلوے سے تہی اس کا ہے آئینہ گفتار

پیر اپنے کریں مصلحتاً عشق مجازی
 ان زہرہ و شوں سے ہنیں کچھ ان کو سروکار !
 کہ فرقہ فروشوں سے حذر، اس سے لگا دل
 یوں سہل وہ پھنسنے کا ہنیں آہوئے تاتار
 بربط سے نہ کر میرے طلب نغمہ راحت
 چھیزوں میں وہ سُر کیسے جو رکھتا ہنیں یہ تار
 گو دل نے تو کی برہمنی، قشقہ بھی کھینچا
 لیکن ہنیں اک آن بھی شائستہ زنار
 میخانے کی صحبت میں زباں عشق نے کھولی
 اک، دیر و حرم میں نہ ملا محرم اسرار

(۳۸)

خوشا ! کہ بلبل شوریدہ سر ہے نغمہ طراز
 عروس لالہ دکھانے لگی کرشمہ و ناز !
 نوا کی اصل حقیقت میں ہے تو پردہ غیب
 نہ تو گلوئے غزل خواں سے ہے نہ پردہ ساز
 وہ شخص جس نے کہ ساز حیات کو چھیڑا
 مری نگاہ میں بندہ وہی ہے محرم راز

مجھے تو پردگیان جہاں کی سب ہے خبر
 مگر زبان نہ کھولوں کہ چرخ ہے کج باز
 سخن درشت نہ کر ، راہ دوستی اپنا
 یہ مل کے بیٹھنا اپنا ہے صرف مولا ساز
 بتاؤ ہے کوئی منزل جہان تیرہ کی
 کہ مثلِ ریگِ رواں سب ہے مائل پرواز
 یہ میرا تن ہے کہ گل باغِ کاشمیر کا ہے
 حجاز سے ہے مرا دل تو ہے نوا شیراز - ۱

(۳۹)

ہیں خاک و تند سیر مثال ستارہ ہم
 اس نیلے یم میں محو تلاشِ کنارہ ہم
 اک شعلہء حیات سے یہ ہست و بود سب
 اور لذتِ خودی سے مگر پارہ پارہ ہم
 عقلِ بلند دست کے ہاتھوں سے نوریو !
 ہیں خاکیانِ دوشِ ثریا سوارہ ہم
 ہیں عشق میں وہ غنچہ کہ لرزے نسیم سے
 اور جہدِ زندگی میں مگر سنگِ خارہ ہم
 نرگس کی طرح ہم نے بھی کھولی ہے اپنی آنکھ
 رو بند کھول دے ، ہیں سراپا نظارہ ہم

(۳۰)

میرے سرشک خوں سے عرب ایک لالہ زار
عجمِ رمیدہ بو، کو ہو میرا نفس بہار

سوز و تپش ہی زیست ہے اور زیست بھی دوام
ہر ذرہ میری خاک کا اک دل ہو بے قرار

منزل پہ ہے قرار نہ رستے میں تجھ کو چین
اے دل! کہ ہے سفر میں، خدا ہی ہو تیرا یار

اک نقش نامرادی بنائے سدا خرد
دل ساز وہ اٹھائے شکستہ ہوں جس کے تار

میرا سخن ہے سوز تمام اور تو ہے خام
میری غزل سرائی یہ ہو، تجھ کو سازگار

گہرائیوں سے دل کی، یہ ہے میری آرزو
شبنم تری بنے کبھی دریائے بے کنار

تیرے نصیب میں نہ ہو اک پل کو بھی قرار
تاب و تبِ حیات بھی ہو تجھ پہ آشکار

(۳۱)

ہمہ تقصیر نظر تیری ، فرد کوتاہی
تجھ کو پہونچائیگی منزل پہ کلیم اللہی

راہ تاریک ہے ، ڈوب آپ میں اے سالکِ رہا
راستہ گم نہیں کرتی تہہ دریا ماہی
میروشہ سے کرے حاجت نہ طلب مردِ غیور
کوہساروں سے بھلا کیسے ہو ممکن کاہی
نغمہ شوقِ مراسم کہ ملیں گے اس میں
رمزِ درویشی و سرمایہ شہانشاہی
ہے نفس میرا تجھے ، گل کے لئے جیسے نسیم
لذتِ آہِ حیر سے ہو اگر آگاہی
اے فلک! آنکھ ابھی بیباک و بلا جو ہے تری
پھر تماشہ تو کیا چاہتا ہے اے واہی

(۳۲)

شراب سے تیری مست و بے خود نہیں کہ اک خم شکن نہیں ہے
نہیں کہ تیرے لبوں سے سرشار کوئی شیریں سخن نہیں ہے
نگاہ میں کھب رہی ہے ہر چند یہ قبائے عرب بھی تجھ پر
نہ ہو جو قامت پہ راست تیرے وہ ایک بھی پیرہن نہیں ہے

یہ لعل لب تیرے گرچہ چپ ہیں مگر ہے تیری نظر تو گویا
 مرے دل خون شدہ سے ہر دم نہ ہو جو محو سخن نہیں ہے
 فقط ترے ذکر ہی کی خاطر سجائی ہے انجمن یہ میں نے
 وگرنہ خلوت کدے میں میرے نہیں کہ اک انجمن نہیں ہے
 طلاقِ معجز سلیمان ذرا تو، پھر سیکھ اے مسلمان !
 کہ تیرے خاتم پہ دیکھتا ہوں نہیں کہ اک اہرمن نہیں ہے

(۲۳)

اگرچہ سر پہ کوئی افسر و کلاہ نہیں
 گدائے کوچہ ترا کم زر پادشاہ نہیں

جوان نیند میں ہیں اور مردہ دل سب پیر
 نصیبِ سینہ کہیں آہِ صبح گاہ نہیں
 اسی بہانے سے دشتِ طلب سے پانوں نہ کھینچ
 کہ تیرے دور میں اک آشنائے راہ نہیں

تو اپنے وقت سے غافل نہ بیٹھ، ڈھونڈ کے لا
 وہ وقت جس میں حساباتِ سال و ماہ نہیں

امیدِ عافیت اس دیر کہنہ میں ہے تجھے ؟
 کہ تیری کشمکشِ زیست پر نگاہ نہیں ا

گناہ میرے لکھے جائیں کاتبانِ عمل
 نصیبِ میرا یہاں کچھ بہ جز نگاہ نہیں

اب آکہ دامن اقبال تھام لیں چل کر
کہ وہ زِ خرقہ فروشانِ خانقاہ ہنہیں

(۴۴)

شعلہ در آغوش ہے یہ عشقِ بے پروا مرا
اک شرر رکھتا ہنہیں ، ہے فلسفہ نازا ^{بے} مرا

ہو چلے کامل تو یکسر ناز ہی ٹھہرے نیاز
قیس کا ہے نام لیلیٰ ، وہ ہے یہ صحرا مرا

لایا ہوں ہندوستان سے میں تری دلیز پر
جو جبہیں میں ہو گیا خون ، سجدہ اک ایسا مرا

تیغ لا اس کافر دیرینہ کے ہاتھوں میں دے
دیکھ پھر اس دہر میں ہنگامہء الا مرا

کیا غیب گردوں ضمیر روزگاراں سے کبھی
دوش سے میرے منور پھر کرے فردا مرا

ہے پہر بارگہ سے تیرے ، عالم مستنیر
اور ہنہیں شایان شاں تو کیا فقط سینا مرا

بات پردے میں خدا سے ہے تو تجھ سے آشکارا
یا رسول اللہ ! وہ پہنا ہے ، تو پیدا مرا

(۳۵)

ہر دم نئے بتوں کو تراشے ! خدا بچائے !!

لیکن نہ اپنے آپ میں ڈوبے ! خدا بچائے !!

یوں گرمی فرنگ سے پگھلائے آپ کو

ہے ، آپ اپنی آنکھ سے ، نکلے ! خدا بچائے

جس کوچے کی ہے خاک ، بھی زر واں تجھے کوئی

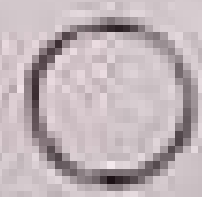
اک نیم غمزے میں نہ خریدے ! خدا بچائے !!

مانا پڑھی کتابِ فرد ، خوب ہی پڑھی

لیکن حدیثِ شوق نہ سمجھے ! خدا بچائے !!

کر کے طوافِ کعبہ ، پھرے گردِ دیر بھی

خود پر مگر نگاہ نہ ڈالے ! خدا بچائے !!



نقش فرنگ

نقشِ فرنگ

پیام

کہہ دے جا کر دانائےِ افرنگ سے آج اے بادِ صبا !
عقل کے جتنے پر کھلتے ہیں ہو جاتی ہے اتنی اسیر

برق یہ اپنے جگر میں سموئے اور وہ اس کو رام کرے
عشق ہے عقلِ فسوں پیشہ سے بڑھ کے جگر دار و خود گیر

آنکھ تو دیکھا کرتی ہے باہر سے رنگِ لالہ و گل
پردہِ رنگ میں ہے جو کچھ ہے، جو نہیں اس پہ ظہور پذیر

حیرت کی کیا بات ہے تجھ کو ملا اگر اعجازِ مسح
حیرت تو یہ ہے کہ ترا بیمار ہے اور بھی کچھ دل گیر

دانش کا اندوختہ رکھتا ہے، دل ہارے بیٹھا ہے
آہ ! یہ کیسا نقدِ گراں مایہ تو گنوائے بیٹھا ہے

فلسفہ و حکمت کا کوئی انت نہیں ہے، یہ سچ ہے
لیکن سلیٰ عشق و محبت ان کے مکتبِ فن میں نہیں

اہلِ دل کی راہ میں بن کر بیٹھے ہوئے ہیں یہ رہزن
کونسا ہے وہ لٹنہ جو ان کی چشمِ پر فن میں نہیں

ان کی ٹھنڈی آگ سے دل کو کوئی گرمی کیا پہونچے
 لذت کوئی ان کی خلش غمزہ کے دامن میں نہیں
 صحرا و کہسار تو چھانے پر نہ کیا صید ایک غزال
 چمن چمن بھی گھومے لیکن اک گل بھی دامن میں نہیں

چارۂ کار یہی ہے اب تو عشق سے چاہیں اپنی کشاد
 اسی کے آگے سجدہ گذاریں ، اسی سے مانگیں اپنی مراد

عقل جب اپنے قدم بڑھائے اس راہِ خم در خم میں
 پانی میں شعلے دوڑائے اور کرے یہ جہاں برہم

ریگِ رواں کو اس کی کیمیا سازی نے زر میں ڈھالا
 جلے ہوئے دل پر اکسیرِ محبت رکھی پر کم کم !

ہائے ہماری سادہ دلی ہم ہو گئے اس کے فسوں خوردہ
 بیٹھ کر اس رہزن نے کمیں میں کھوٹی کی راہِ آدم

اس کے ہنر نے خاک سمیٹی ہتذیبِ افرنگی سے
 اور اس خاک سے آلودہ کردی چشمِ ابنِ مریم !

شرارے بوکر ، شعلوں کی اک فصل اگانا ! یہ کب تک ؟
 پھلے دل میں گرہ ڈالنا، کھولے جانا ! یہ کب تک ؟

عقل خود ہیں اور ہی کچھ ہے ، عقل جہاں ہیں ہے کچھ اور
 بلبل کا پر اور ہی کچھ ہے ، بازوئے شاہیں ہے کچھ اور

پڑے ہوئے ہوں خاک میں دانے ، ان کا چننا بھی ہے کچھ
 اور غذا ہو جس کی فلک پر دانہ پرویں ، ہے کچھ اور
 مثل نسیم جو سیر چمن کی کرتا ہے ، ہے اور کوئی
 اور وہ جو پہونچے بہ ضمیر غنچہ و نسریں ہے کچھ اور
 پردہ نے افلاک اٹھانا اپنی نظر سے بات ہے ایک
 رہ جائے جو ہو کر رہن ظن و تمہیں ہے کچھ اور

خوشا وہ عقل کہ دو عالم کی پہنائی ہے جس کے ساتھ
 نور فرشتہ اور آدم کا سوزِ دل ہے جس کے ہاتھ

ہم کہ نکل آئے ہیں باہر عشق کے خلوت خانے سے
 خاک پا کو ہم نے آئینے کی طرح چمکایا ہے
 دیکھ ہماری ہمت ہم نے لگادیا ہے داؤں پر
 دونوں جہاں کو کھوکے بہ ظاہر اور بہ باطن پایا ہے
 ہمارے آگے رواں دواں ہیں سلسلہ ہائے شام و سحر
 جوئے رواں کے کنارے ہم نے خیمہ اپنا لگایا ہے
 دل میں ہمارے ، جس نے شیخوں دیر کہن پر مارا ہے
 ایسی آگ بھری ہے جس نے خشک و تر کو جلایا ہے

ہم کہ کبھی شعلہ تھے ، ٹوٹے اور شرراک بن بیٹھے
 صاحب ذوق و تمنا بن گئے اور نظر اک بن بیٹھے

عشق نے پیشہ ہوس کا جب اپنایا توڑے سارے بند
 آدم اس کے لٹنے سے ، کھپلی جیسے پھندے میں پھنسے
 بزم سے ہو کے کنارہ کش ، کی رزم آرائی ، فوج بنائی
 اپنوں ہی کے سنیہ و گردن پر اس کی شمشیر پڑے
 راہزنی کی رکھی بنا اور نام جہاں بانی کا دیا
 سرمایہ داروں کے ستم سے کمزوروں کی کمر ٹوٹے
 بے شرمی کے ساتھ ہے جاری شورِ رقص و رامش و رنگ
 اپنے عزیزوں ہی کے خون سے اپنے خالی جام بھرے
 آگہ بھی ہے وقت کہ مل کر ایک نیا آئین بنائیں
 پاک کریں لوحِ دل دھو کر ، نئے سرے سے آگے آئیں
 سر سے تاج گرے شاہوں کے ، شورشِ یغمانی رخصت
 ٹوٹ گئی نے اسکندر کی ، نغمہ دارائی رخصت
 کوہکن آیا شیشہ بدست اور طلب کرے ہے پروہڑی
 سرمایہ داروں کی عشرت ، محنتِ لالائی رخصت
 یوسف کنعاں قید سے چھوٹ کے بن بیٹھا ہے عزیزِ مصر
 سارے فسانے ختم ہوئے ، افسونِ زلیخائی رخصت
 راز تھے جتنے پوشیدہ سب فاش ہوئے بازاروں میں
 سحرِ سخن سازی کا ٹونا ، انجمن آرائی رخصت

آنکھیں کھول اگر تیری آنکھوں میں نظر کچھ دیکھے ہے
زندگی ایک نئی ہی دنیا کی تعمیر کے درپے ہے

میں تو آج اس خاکِ کہن میں گوہرِ جاں کو دیکھتا ہوں
ہر ذرے میں انجمِ ساں چشمِ نگران کو دیکھتا ہوں

دانہ جو آغوشِ زمیں میں کرتا ہے آرام ابھی
اس میں پھلتے پھولتے پورے نخلِ جواں کو دیکھتا ہوں

کوہ کو دیکھ رہا ہوں سبک میں گھاس کے تنکے کے مانند
گھاس کے اک تنکے میں شکوہِ کوہِ گراں کو دیکھتا ہوں

اتھل پھتل ایسی نہ سماپائے جو ضمیرِ گردوں میں - ا
یہ تو ہنیں معلوم کہ میں کیسے اس عیاں کو دیکھتا ہوں

خوش قسمت ہے جو اس گرد میں کوئی سوار آتا دیکھے
تار کی جنبش کے اندر نغمے کو برماتا دیکھے

زیست تو ہے اک بہتی ندیا، رواں رہے گی، رہی رواں
یہ مئے کہنہ سدا جواں ہے، جواں رہے گی، رہی جواں

جس کو ہنیں ہونا ہے اور ہے اس کا مقدر ہے ثنا
جس کو ہونا ہے پہ ہنیں ہے، رہ ہنیں پائے گا وہ ہناں

عشق سراپا نظر بنا ہے اک دیدار کی لذت سے
حسن سدا مشتاقِ نمود ہے، ہونا ہوگا اسے عیاں

آہ! وہ دھرتی جس پر میں نے خون کے آنسو روئے ہیں
میرے آنسو اس کے جگر میں بن جائیں گے لعلِ گراں

”مژدہ“ صبح ان کالی کالی راتوں ہی میں ہے پنہاں
شمعِ جوہنی دم توڑتی ہے تو سورج کا ملتا ہے نشان“

(غالب)

آزادی بحر

کہا بٹ نے "ہوا ہے بحرِ آزاد
یہی فرمان آیا ہے خضر کا"

مگر مچھ نے کہا "چاہے جہاں جا
پہلے سے بے خبر ہو کر نہ جانا!"

جمعیت الاقوام

تاکہ اس دنیا سے ہو جنگ و جدل کا خاتمہ
 ورد مندان جہاں نے طرح نو رکھی جدا
 میں بس اتنا جانتا ہوں، کچھ کفن چوروں نے کی
 بہرِ تقسیمِ قبور اک انجمن آراستہ

شوین ہارو نیٹشا

مرغِ چمن وہ سیرِ چمن کے لئے اڑا
 اک خار اس کے پیکرِ نازک میں چبھ گیا
 بولا : ہے فطرتِ چمن روزِ گار بد
 کھاتا تھا گاہ اپنا وہ غم ، گاہ غیر کا
 غنچہ کھلا تو سمجھا فریب بہار ہے
 اک داغ بے گناہی کا لالہ اسے لگا
 بولا : کہ اس سرانے کی بنیاد ہی ہے کج
 ہر صبح کی جبیں پہ ہے اک داغِ شام کا
 روتا تھا حسبِ حوصلہ ہر دم وہ نغمہ گر
 خوں ہو کے نغمہ آنکھوں سے اس کی رواں ہوا
 اس کی فغاں کو سن ، دلِ ہدہد ہوا دو نیم
 اس کے بدن سے پھینچ کے کانٹا جدا کیا
 بولا : زیاں کی جیب سے حاصل کر اپنا سود
 گل نے شکافِ سینے سے پیدا نہ زر کیا
 درماں بنالے درد کو ، گرخستہ تن ہے تو
 خوگر ہو خار کا تو سراپا چمن ہے تو

فلسفہ و سیاست

فلسفی کو اور سیاست داں کو ہم پلٹ نہ جان
آنکھ اس سورج کی اندھی، نم ہنسیں اس میں دخیل
لائے وہ کم زور حجت قول حق کے واسطے
یہ تراشے قولِ باطل کے لئے محکم دلیل

صحبتِ رفتگان

(عالمِ بالا میں)

ٹالسٹائے

شہر یاروں کے ہیں لشکرِ خاصانِ اہرمن
صرف روٹی کے لئے تیغِ ستم کھینچے ہوئے

حبِّ غیر ان پر کرے ہے دوستوں کا خونِ حلال
زشت ، نیک انکی نظر میں اور غافل مغز سے

ہیں یہ بے ہوشی کی مئے تاج و کلیسا و وطن
جاں فریدی خواجہ نے بدلے میں صرف اک جام کے

کارل مارکس

رازِ دانِ جزوِ وکل اپنے سے نامحرم ہوا

حبِّ سرمایہ میں آدم ، قاتلِ آدم ہوا

-۱- سرمایہ دار

کارل مارکس (۱۸۱۸-۱۸۸۳) جرمنی کا مشہور ماہر اقتصادیات جس نے سرمایہ داری کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ اس کی مشہور کتاب موسوم بہ "سرمایہ" کو مذہبِ اشتراک کی بائبل تصور کرنا چاہیے۔ (اقبال)

ہینگل

معنی مستور ہے جلوہ وہ باغ و راغ
دیکھ حقیقت میں ایک حنظل و انگور کو ۔ !

فطرتِ اضداد نے لذتِ پیکار دی
خواجه و مزدور کو ، آمو و مامور کو ۔ !

طالستائے

عقل دورو^۳ نے جنا فلسفہ خود پرست
درسِ رضا دیتا ہے بندۂ مزدور کو ؟

مزدوک

خاکِ ایراں میں جو میں نے بیج بویا تھا کبھی
کشتِ زارِ زار و قیصر میں ہوا ہے بارور

قصرِ سلطانی میں رقصِ مرگ دیکھا چاہیے
میر و سلطان کے لبوں پر الامان والحدار !

آتشِ نمرود میں تھا مدتوں سوزاں خلیل
تب کہیں جا کر حرم سے بت ہوئے بیرونِ در

دورِ پرومیزی گیا، اے کشتہء پرومیز اٹھ !
نعمتِ گم گشتہ اپنی چھین پنخہ موڑ کر

کوہکن

سادہ ہے معشوق میرا اور کم آمیز ہے
لتنہ انگیز و ستیزہ کیش و ظلم انگیز ہے

دیکھنے میں ہے ہمہ بزم ، اور اندر سے ہے رزم
ہے زباں اس کی مسیح اور دل بڑا چنگیز ہے

دیدہ پگھلایا ، خرد کھوئی ، جنوں اپنالیا
جلوہ فرما ہو ، مری جاں شوق سے لبریز ہے

میرے تیشے نے اگرچہ کوہ سارا ڈھا دیا
گردشِ دوراں ابھی تک ہمدمِ پرویز ہے

فرش سے تا عرش ہر شے راہ پیما ہے یہاں
یوں ہی چلتا رہ ! کہ چال اس کارواں کی تیز ہے

جلال و ہیگل

ناخنِ فکر سے میں کھولتا تھا عقدہ ہائے حکیم المانی
 ابدی کو برسہہ اس نے کیا پیرہن جس کے تن پہ تھا آنی
 اس کی موج خیال کے آگے ہوئی گیتی کو تنگ دامانی
 اس کے دریا میں پانو رکھتے ہی ہوئی کشتی عقل طولانی
 اس کے افسوں نے بند کی یوں آنکھ کوئی باقی رہا نہ کچھ فانی
 نیند میں چشمِ شوق تیز ہوئی جلوہ فرما تھے پیرِ یزدانی
 ہوا جس مہر کی تھلی سے افق روم و شام نورانی
 اس کا شعلہ جہان تیرہ میں دشت میں اک چراغ رہبانی
 حرف سے اس کے معنی اگتے ہیں جس طرح لالہ ہائے نعمانی
 مجھ سے بولے "یہ نیند کیا ہے؟ اٹھ! تو نے سمجھا سراب کو پانی؟

راہِ عشق اور عصائے عقل کج
 ڈھونڈتا ہے چراغ سے سورج

نیشنا

سستی انسان کے عناصر میں جو دیکھی، پھٹ پڑا
 فلسفی نے ڈالی اک مضبوط پیکر کی بنا
 سینکڑوں آشوب اٹھائے تازہ تر افرنگ میں
 کارگاہِ شیشہ گر میں گویا اک دیوانہ تھا

حکیم آئن سٹائن

طالب جلوہ ہے وہ مثلِ کلیمِ نابھور
فائش یوں روشن ضمیر اس کا کرے اسرارِ نور

ایک پل میں آسماں سے چشمِ آدم تک چلے
نور کی رفتار ایسی جس میں عاجز ہے شعور

جائے خلوت میں تو معدن میں بنائے کوئلہ
اور جلوت میں شجر جلنے لگے بالائے طور

نزد و دور و دیر و زود و پست و بالا سے بلند
اس طلسمِ چند و چون و بیش و کم میں بے مرور

تاروشید و سوزو ساز و مرگ و زیست اس میں حلول
سوز اس کا اہرمن ، ہیں ساز میں جبریل و حور

کیا بتاؤں اس حکیمِ نکتہ^(x) ور کا میں مقام
نسلِ موسیٰ^(xxx) میں کیا زرتشت نے گویا ظہور

۱۔ جرمنی کا مشہور ماہر ریاضیات و طبیعیات جس نے حال میں نظریہ اشافیت کا حیرت انگیز انکشاف کیا ہے۔
(اقبال)

۲۔ بے تغیر و تبدیل ○○ تاریکی اور روشنی ○○○ یہودی نسل
(x) ایران کا مشہور حکیم (۹۰۰ ق م تا ۸۰۰ ق م) مسئلہ نور کا اولین علمبردار، جس کے پیرو بعد میں آفتاب پرستی اور آتش پرستی کا شکار ہو گئے (دیکھئے طاسین زرتشت (جواد یونس) (مترجم)

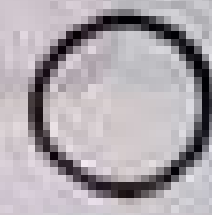
باترن

خاکِ گلشن پر اگر اک قطرہ اس کے جام سے
گر پڑے تو لالہ و گل کی طرح شعلے اگیں

ناموافق تھی اسے افرنگ کی ٹھنڈی ہوا
خود محبت چنچ اٹھی ، تھا سوز وہ پیغام میں

کس پری خانے کی نیو اس کے تخیل نے رکھی
نوجواں اک جلوے سے اس کے بہک کر گر پڑیں

طائرِ معنی خود اپنا آشیانہ چھوڑ کر
پھنس گیا خود آکر اس کے حلقہ ہائے دام میں ا



انگلستان کا مشہور شاعر (۱۷۹۸-۱۸۲۳ء)

نیٹشنا

ہے اگر نغمے کا خواہاں تو ، گریزاں اس سے ہو
کیونکہ بجلی کی کڑک اس کے قلم کی کے میں ہے

قلبِ مغرب میں اتارا اس نے اپنا نیشتر
اس کے دونوں ہاتھ ہیں خونِ چلیپا سے رنگے

طرحِ بت خانہ رکھی اس نے یہ اندازِ حرم
گو دماغ اس کا ہے کافر ، پھر بھی مومن قلب ہے !

ہاں ! جلادے خود کو اس کی آتشِ نمرود میں
گلشنِ ابراہیم کا ہوتا ہے پیدا آگ سے !



یعنی صلیب مراد عیسائیت جس کا نیشٹا نے رد کیا (م-۱۲)

نوٹ۔ نیشٹا نے مسیحی فلسفہ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے اس کا دماغ اس لئے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے
گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں "قلب او مومن دماغش کا فراست"
نبی کریم نے اس قسم کا جملہ امیہ ابن الصلت (عرب شاعر) کی نسبت کہا تھا آمن لسانہ و کفر قلبہ
(اقبال)

پٹوئی

(ہنگری کا جواں مرگ شاعر جو وطن کی حمایت کے معرکہ کارزار میں مارا گیا
اس کی نعش نہیں مل سکی کہ کوئی یادگار بنائی جاسکے)

عروس گل کے نغمے لے کر اس گلشن میں تو آیا
مثالیاً ایک غم اور ایک غم ہر دل میں بھڑکایا

کفِ لالہ میں پھر مہندی رچائی خون سے اپنے
فغانِ صبح گاہی سے دلِ ہر غنچہ اکسایا

ہوا اپنی نوا میں گم سخن ہی تیرا مرقد ہے
ہنیں تھا تو زمیں سے ، سوترا مرقد نہ بن پایا

فرانسیسی فلسفی آگسٹس کومت اور مزدور کے درمیان ایک مکالمہ

کومت

سب اک دوسرے ہی کے اعضا ہیں ہم
کہ ہیں ایک ہی نخل کے برگ و بار

اگر پانو چلتے ہوں ، سوچیں دماغ
تو سارا یہ فطرت کا ہے کاروبار

کوئی کار فرما کوئی کارساز
کرے کیسے محمود کارِ ایاز

ہوا ہے یہ تقسیم سب کارِ زیست
سراپا چمن ہو گیا خارِ زیست

مزدور

۱۔ دے مجھ کو اتنا فریب اے حکیم
ہے مشکل شکستِ طلسمِ قدیم

۲۔ مسِ خام پر آبِ زر تو چرمھائے
مجھے صرف گردن جھکانا سکھائے

۳۔ مرا ایم کرے آبِ جو میں اسیر
نکالوں میں، لے جائے تو جوئے شیر

دلالتا ہے خسرو کو اے نکتہ سنج
حق کو نکلن اور بلا جھیلے رنج

۴۔ نہ حکمت سے ٹھہرا خطا کو صواب
خضر کو نہ لا زیرِ دامِ سراب

زمین کا ہے بوجھ ایک سرمایہ دار
فقط کھائے اور سوئے وہ بیچ کار

یہ خوش حالیاں جگ کی اے کم نظر
ہیں مزدور کی محنتوں کا ثمر

۵۔ نہیں جانتا تو کہ سرمایہ دار
حقیقت میں ہے چور بھی کم غیار

۶۔ کرے جرم کو اس کے پوزش عطا
بہ این عقل دھوکا بھی تو کھایا

ہیگل

اگرچہ اس کی حکمت تو بہت معقول ہے لیکن
ہنیں اس کو میرِ خلوتِ "محسوس" جانا نہ
وہ اس کا طائرِ فکرِ فلک پیمانہ تو ایسا ہے
کہ جیسے بیضہ بے مرغ زر خیزی سے بیگانہ

جلال گوینڈے

نکتہ دانِ المنی^۱ وہ خوش نوا^۲ حضرت رومی سے جنت میں ملا
شاعروں میں شاعر عالی جناب ہیں نہ پیغمبر پہ ہیں صاحب کتاب
قصہء پیمانِ ابلیس و حکیم سن کے وہ دانائے اسرار قدیم
بولے: ہے تیرا سخن جاں کی بہار تو فرشتہ صید اور یزداں شکار
کنجِ دل میں فکر تیری گوشہ گیر عمر تازہ پاکئی دنیائے پیر
تن میں دیکھا سوز و سازِ جاں ادھر دیکھی سپی میں بھی تعمیر گہر
سب تو رمزِ عشق سے آگہ نہیں وا ہراک پر یہ درِ درگہ ہنیں
ہے جو محرم راز کا یہ جانتا ہے بس وہی

عشقِ آدم سے ہے اور ابلیس سے ہے زیرکی! (رومی)

نوٹ: ۱۔ ان المنی سے مراد گوئٹے ہے جس کا ڈرامہ "فاوسٹ" مشہور و معروف ہے۔ سن ڈرامے میں
شاعر نے حکیم "فاوسٹ" اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی
نشوونما کے تمام ارجح اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آسکتا۔ (اقبال)

مرعی اگر بغیر قربتِ مرغِ انا اوسے تو اس سے چوزے نہیں نکلتے (مترجم)

۱۔ ہرمنی ۲۔ گوینڈے ۳۔ گوینڈے کی مشہور تصنیف "فاوسٹ" مراد ہے۔ (مترجم)

پیغامِ برگساں

تا تجھ پہ آشکار ہو ہر رازِ زندگی
شعلے سے خود کو دور مثالِ شرر نہ کر

نظارہ کر فقط نگہِ آشنا کے ساتھ
اپنے وطن میں بن کے بدیسی گزر نہ کر

ہے نقش تیرا بستہِ اوہامِ باطل اب
وہ عقل لاکھ دل سے جو سیکھے ذرا ادب

○ میخانہٴ فرنگ

اف وہ دن خم خانہٴ فرنگ میں تھا میں ، جہاں
جام تھا روشن تراز آئینہٴ اسکندری

مے فروشوں کی نظر میں بادہ تھا پروردگار
چشمِ ساقی مے کشوں کی کرتی تھی پیغمبری

جلوہ اس کا بے کلیم اور شعلہ اس کا بے خلیل
عقل کا مقصد متاعِ عشق کی غارتگری

آہ بے تابانہ کی گرمی سے تھی خالی ہوا
لغزشِ مستانہ سے ہر رند واں محروم تھا

موسیٰ ولینن و قیصر ولیم

موسیٰ ولینن

وہ دن گئے کہ جب اس دیر کہنہ میں آدم
 مثال دانے کی، چکی میں پستا رہتا تھا
 فریب زاری و افسونِ قیصری کھاتا
 بچارا دامِ کلیسا میں جکڑا رہتا تھا
 کیا ہے چاک اسے بھوکے غلام نے آخر
 ہمارے خوں سے رنگا جس کا کرتا رہتا تھا

آتشِ جمہور میں ہر کہنہ ساماں جل گیا
 ہو قبا سلطان کی یا پیرِ کلیسا کی ردا !

قیصر ولیم

گناہِ عشوہ و نازِ بتاں کیا لگانا پھیرے خوئے برہمن ہے
 خدا وندان نو ہر دم تراشے کہ مزار از خدایان کہن ہے
 ستم کا رہزنوں کے شکوہ کیسا کہ رہو آپ اپنا راہ زن ہے
 اگر جمہور بیٹھے تاجِ خسرو وہی ہنگامہ آرا انجمن ہے
 ہوس مرتی ہنیں آدم کے دل میں وہی آتشِ درونِ مرزغن ہے
 عروسِ اقتدارِ بحرِ فن کو وہی بیچاکِ زلف پر شکن ہے
 ہنیں ہے نازِ شیریں بے خریدار
 اگر خسرو ہنیں تو کوہکن ہے !

حکما

(بزمِ فلسفیاں)

لاک

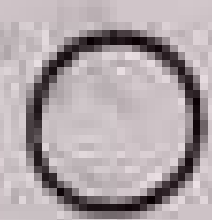
اس کا ساغر ہے بحر کے بادۂ خورشید سے روشن تمام
ورنہ محفل میں تو آیا تھا لئے لالہ تھی سا ایک جام

کانت^۲

فطرت اس کی لائی ہے ذوقِ مئے آئینہ فام
اور شبستانِ ازل سے اک ستارہ جیسا جام

برگساں^۳

اس نے لائی ہے ازل سے مئے نہ لایا کوئی جام
لالے نے داغِ جگر سے لایا ہے سوزِ دوام



شعرا

بروننگ

بے پشت ہے جو بادہ سر جوشِ زندگی کا
آبِ خضر کو لیکر ساغر میں ڈالتا ہوں

باترن

احسان کیوں خضر کا کوئی مری بلا لے
پانی جگر سے لے کر ساغر میں ڈالتا ہوں

غالب

"تا بادہ تلخ تر ہو اور سسینہ ریش تر ہو
پگھلا کے آنگینے ساغر میں ڈالتا ہوں"

رومی

آمیزشیں کہاں اور پاکی کہاں گہر کی
لیتا ہوں تاک سے راست ساغر میں ڈالتا ہوں

خراباتِ فرنگ

رات کی بات ہے کل ، سوائے خراباتِ فرنگ
یہ مرا ذوقِ تماشا مجھے لے کر پہونچا
شوخی گفتار وہاں رند ملا اک مٹھکو
اس کی کچھ باتوں نے گرویدہ بنایا اپنا

بولا : " پیارے ! یہ کلیسا تو نہیں ہے کہ یہاں
صحبت زہرہ و شاں ہے نہ سرود و نغمہ

ہے خراباتِ فرنگ اور یہاں ملتی ہے وہ سب
جس کے پینے سے برا بھی نظر آتا ہے بھلا

نیک و بد کا یہاں پیمانہ ذرا اور ہی ہے
کہ ترازوئے نصاریٰ و یہودی میں ہے پائنگ بڑا

خوب ہے زشت اگر اس کا نتیجہ ہو شکست
زشت ہے خوب جو ہو تاب و تواں تیری سوا

غور سے دیکھ حیات ایک ریاکاری ہے
مٹ گیا وہ کہ رہا جو گروِ صدق و صفا

پیرومرشد کا ہمارے ہے یہ قولِ فیصل
مسل چاندی کے مس خام کو اپنے چمکا

دعویٰ صدق و صفا کچھ بھی نہیں ، کچھ بھی نہیں
کچھ اگر ہے تو ہے ناموسِ ریا کا پردا

کہہ گیا ہوں یہ کچھ اسرارِ ہناں خانہٴ زیست
باندہ کر رکھ لے گرہ میں ، نہ کر ان کو افشا

انگلستان سے خطاب

اہل مشرق نے چکھی بینائے افرنگی سے مئے
 توبہ دیرسینہ توڑی ہے تو حیرت اس میں کیا
 فکرِ نو نے اس کی سیکھا شیوہ تدبیرِ نو
 خون ، قسمت کے پجاری کی رگوں میں بول اٹھا
 ساقیا ! اس شورشِ مستاں سے مت ہو تنگدل
 خود بتا انصاف سے ، یہ سب کھڑا کس نے کیا
 وہ تو خود ہے بوئے گل ہی سوئے گلشن رہنا
 ورنہ ، اک گلشن بھی ہے ، بلبل کو اس کا علم کیا !

قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور

مجھ سے ہے کارخانہ آہنگری کا شور
 گل بانگِ ارغنونِ کلیسا ترے لئے
 میرا وہ نخل جس سے کہ لیتا ہے شہِ خراج
 باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ ترے لئے
 تلخابہ وہ ہے میرے لئے ، دردِ سرِ جولائے
 صہبائے پاکِ آدم و حوا ترے لئے
 مرغابی و تدر و کبوتر مرا نصیب
 نخلِ ہما و شہپرِ عنقا ترے لئے
 یہ خاک اور اس میں ہے جو کچھ مرا نصیب
 از خاک تابہ عرشِ معلیٰ ترے لئے

نوائے مزدور

یہ مجھ غریب کی محنت کشی کا ہے انعام
ملا ہے خواجہ ناکارہ کو لباسِ حریر !

ہے حاکموں کی انگوٹھی میں میرے خون کی لہر
ہے میرے بچے کے آنسو سے سب شکوہ امیر

مرے لہو سے کلیسا ہے جونک سا فریب - !
ہے میری قوتِ بازو سے سلطنت ہمہ گیر

خراہ رشکِ چمن گریہِ بحر سے مرے
شبابِ پھولوں کا میرے جگر کے پانی سے

اٹھو کہ ساز سے اب تازہ نغمہ پھونما ہے
وہ مئے جو شیشے کو پگھلا دے اس سے جام بھریں

نیا نظام کوئی لائیں میکدے کے لئے
جو میکدے ہیں پرانے اب ان کو دھکا دیں !

چمن کے راہزنوں سے ہے انتقام کا وقت
گلوں کی بزم میں آ ! اک نئی طرح ڈالیں

طوافِ شمع میں پروانہ ساں جنتیں کب تک
خود اپنے آپ سے بیگانہ ساں جنتیں کب تک

متفرقات

(گہریزے)

(۱)

دیکھ ہر ذرہ ہمارا کھا رہا ہے بیچ و تاب
 اب یہ ہر اک سانس جیسے اک قیامت کی گھڑی
 خضر نے ظلمات میں اک دن سکندر سے کہا
 موت مشکل ہے پہ مشکل اور بھی ہے زندگی

(۲)

موتی ہے ادا شناسِ دریا ، لیکن
 چکی کی وہ گردشوں کو کیا جانے

(۳)

کھٹ اندر سے ہے خالی اس لئے ہے نالہ زن
 سرمئی پنسل مگر کرتا ہنہیں شورِ صریر

(۴)

آستیں میں رکھ کے بت میں نے کیا طوفِ حرم
 میں نے ہی آگے بتوں کے نعرہ ہائے ہو لگائے
 اک تقاضا جستجو کا دل میں باقی ہے ابھی
 بال سے باریک رستے پر قدم میں نے اٹھائے

(۵)

گل بولا کہ عیشِ نو بہاراں اچھا
 اک صبح چمن برسوں ، مہینوں سے بھلی
 قبل اس کے کہ رکھ لے تجھے دستار میں کوئی
 خود شاخ سے گر کے جان دیدے اپنی !

(۶)

بچہ ، بوڑھا ، بڑا ، جوان
 کوئی بھی ہو سکتا ہے سخن گو !
 یعنی سخن گوئی کے لینے تم
 سال و ماہ کی قید نہ رکھو !

(۷)

تین چیزوں سے اضافہ ہوتا ہے بنیائی میں
 یعنی سبزہ ، بہتا پانی اور کسی کا روئے خوش
 تین یہ چیزیں یونہی کرتی ہیں قربہ جسم کو
 ریشمی کپڑا ، طرب انگیزیاں ، اور بوئے خوش

(۸)

اے برادر ! زندگی کا تجھ کو دیتا ہوں نشان
 نیند ہلکی موت ہے اور موت ہے خواب گراں

(۹)

طاقتِ عفو اگر نہیں تجھ میں
 اٹھ کے ہو دشمنوں سے صفِ آرا
 سینے میں دے جگہ نہ کینے کو
 سرکہ کو اپنے شہد میں نہ ملا !

(۱۰)

یہ نزاکت اور یہ شاعر کی طبعِ موشگاف
 ایک جھونکے سے ہوا کے اس کا ٹوٹے آئینہ
 کیسے کر سکتا ہے شرحِ کارزارِ زندگی
 بلبلہ دریا میں ٹوٹا اس کا رنگ اڑنے لگا !

(۱۱)

اس جہاں میں اک کہستانی ندی کی طرح سے
 راہ کے ہر اک بلند و پست سے آگاہ ہو
 یہ نہیں ممکن تو بن جا ایک سیلِ بے اماں
 لائے خاطر میں کسی پست و بلندِ راہ کو !

(۱۲)

پھول چننا ہے تو نوکِ خار کا شکوہ نہ کر
 خار بھی تو ہے بہاروں ہی کا پالا اے سپر !

(۱۳)

کیوں لگاتا ہے یہ اپنے ریش و ابرو پر خضاب
 کیا چرانے سے یہ ماہِ وسال آتا ہے شباب

(۱۴)

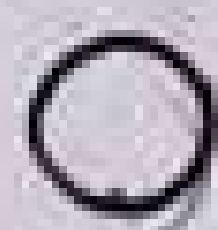
دو ہمتوں کو عشق بناتا نہیں ہے یار
شاہیں تدرود مردہ کا کرتا نہیں شکار

(۱۵)

نقدِ شاعر یعنی شعر و شاعری
زیست کے بازار میں چلتی نہیں
نسترن کے پھول کے بدلے میاں !
کیا کوئی روٹی خریدے ہے کہیں !

(۱۶)

مناسب ہے جو مرد نیک کوئی
پرانے توڑ کر سب بند نکلے
اگر تقلید ہوتی شیوہ خوب
پیہر بھی رہِ اجداد چلتے



اشارات

تشریح

سلسلہ نمبر صفحہ نمبر شخصیت عنوان نظم

امیر کابل ۱۹۱۹ء میں تخت نشین ہوئے انگریزوں کے خلاف جنگ کی اور انھیں شکست دی، انگریزوں نے شکست کھا کر افغانستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ امیر موصوف نے پھر ملکی اصلاحات کی طرف توجہ دی لیکن طبقہ علماء نے ان کی اصلاحی تحریکوں کو ناکام بنا دیا اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت تخت سے دست برداری اور جلاوطنی کے شکار ہوئے اور اقبال کی یہ "پیش کش" رائیگاں گئی۔

وائے بر آرزو کہ خاک شدہ

شاید اسی پس منظر میں اقبال نے کہا تھا

میں بدانتا ہوں انجام اس کا

جس معرکے میں ملا ہوں غازی

لطف تو یہ ہے کہ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ انھیں علاموں اور ملاؤں نے پچھلے چند سالوں میں افغانستان کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا ہے۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

سلطان مراد، ترک حکمران۔ اس لقب کے پانچ حکمران گذرے ہیں۔ پتہ نہیں اقبال کی مراد کون ہے۔

مشہور صحابی رسول جو بعد میں مدائن کے گورنر ہوئے جو اپنی فقر اور سادگی کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ اقبال کے نہایت پسندیدہ کرداروں میں سے ایک اہم کردار ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا (۵۳۷ء - ۵۹۸ء) دنیائے اسلام کا نامور فلسفی، بخارا میں پیدا ہوا۔ اس کی تصانیف میں اشارات الشفا (۱۸ جلد) نجات اور قانون بہت مشہور ہیں۔ موزر الذکر کتاب پچھلی صدی تک یورپی جامعات میں پڑھائی جاتی تھی۔

ظہیر الدین ظاہر بن محمد غریبانی (وفات ۱۲۰۱ھ) بارہویں صدی کا مشہور فارسی شاعر

جوہان وولف گانگ گوئے (۱۷۹۹-۱۸۳۲ء) جرمن شاعر، ڈرامہ نگار، ناول نگار اور فلسفی تفصیلات کے لئے دیکھئے دیباچہ کتاب از علامہ اقبال اور حاشیہ زیر نظم جلال و گوئے

جرمنی کا مشہور اسرائیلی شاعر ہیزینگ ہائینا (۱۷۹۷ء - ۱۸۵۶ء) عشقیہ شاعری کا امام جس کا ٹٹھانک معترف تھا۔

۲۱ امیر امان اللہ خاں ہمیش کش

۲۵ -۲ شہنشاہ مراد ہمیش کش

۲۵ -۳ سلمان فارسی ہمیش کش

۹۳ -۴ بوعلی سینا کتاب کا کیرا

۹۳ -۵ غریبانی

۱۱۶ -۶ گوئے

۱۱۹ (۱) حور و شاعر

۱۸۵ (۲) نغمہ محمد

(۳) جلال و گوئے

۱۱۸ -۷ ہائینا زندگی و عمل

دوسرا بیٹا ابوالعظیم شمس الدین محمد جو شاہ عالم بہادر شاہ اول کے لقب سے ۱۷۰۷ء میں تخت نشین ہوا اپنے باپ کی درازی عمر سے تنگ آگیا تھا ایک خانگی مجلس میں اپنے مصاحبوں سے یہ بات کہی کہ عالم گیر جلد دنیا سے اٹھے کہ اس کی دلی آرزوئے تخت نشینی برآئے کہ اس کی عمر پچھن سے تجاوز کر چکی تھی۔ عالم گیر کی خفیہ اتنی کار کردہ تھی کہ اس بات کی اطلاع اسے ہو گئی جس کے جواب میں اس نے اپنے پیٹے کو جو خط لکھا اسی کو اقبال نے نظم کیا ہے۔

مرزا محمد طاہر معنی کشمیری (۱۷۳۹ء - ۱۷۷۹ء) عہد عالمگیری کا ایک نہایت خوددار اور قناعت پسند شاعر تھا عالمگیر کی طلبی پر کھلوادیا کہ دیوانہ ہو گیا ہے اور واقعی دیوانہ ہو کر تین چار روز بعد بہ عمر ۳۰ سال وفات پائی۔ سری نگر میں مدفون ہے۔ اس نظم میں اس کے ایک قول کو نظم کیا گیا ہے۔

ترکی کا مشہور جابر اور مطلق العنان حکمراں جس نے جولائی ۱۹۲۲ء میں یونانیوں کے خلاف جارحانہ اقدام شروع کیا اور ستمبر ۱۹۲۲ء میں سمرنا فتح کر لیا جس پر اسے اتارک (پدر قوم) کے لقب سے نوازا گیا اور سارے عالم اسلام میں جشن چراغاں منایا گیا۔ یہ نظم اسی وقت کی یادگار ہے لیکن جس نے بعد میں علامہاؤں اور ملاؤں کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر (جو کہانی ان دنوں افغانستان میں دہرائی جا رہی ہے) ایک سیکولر اسٹیٹ کے قیام کا اعلان کیا تو اقبال بڑے مایوس بھی ہوئے اور یہ شعر کہا

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
جرمنی کا مشہور فلسفی (۱۷۸۸ء - ۱۸۶۰ء) جس کے فلسفے میں انسانی ارادے کو جو انسان کو زندہ رہنے پر مجبور کرتا ہے، وہی مرکزی حیثیت حاصل ہے جو مذہب میں خدا کو دی جاتی ہے لیکن انسانی ماحول حصول آرزو میں رکاوٹ ہے۔ زندگی سراسر کلفت، رنج و الم اور مصیبت کا نام ہے۔ ہم زندگی بھر موت سے برسریکار رہتے ہیں اور انجام کار وہ ہم پر غالب آجاتی ہے عورت کو وہ فساد کی جرہ قرار دیتا ہے کہ اس کی وجہ سے زندگی کا تسلسل باقی ہے ہماری شاعری میں اس کے فلسفے کو فانی بدایونی نے بڑے ہمایاتی اظہار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۸ - عالم گیر کا بیٹا عالم گیر کا خط ۱۱۸

۹ - معنی کشمیری معنی کشمیری ۱۲۵

۱۰ - مصطفیٰ کمال پاشا مصطفیٰ کمال پاشا ۱۲۶

۱۱ - شوپن ہار شوپن ہار و نٹشا ۱۷۵

جرمنی کا مشہور فلسفی (۱۸۲۳ء - ۱۸۹۹ء) شوپن ہار کا شاگرد لیکن اپنے استاد کے برعکس اس نے اثبات حیات کا درس دیا فوق البشر کا نظریہ پیش کیا کہ طاقت حاصل کرو اور کمزوروں پر حکومت کرو۔ اس نظم میں مرغ چمن، شوپن ہار اور ہد ہد ٹٹھا کی علامت بہ طور استعمال ہوئے ہیں۔ (دیکھئے حاشیہ صفحہ ۱۸۲)

کاؤنٹ لیوناسٹائے (۱۸۲۸ء - ۱۸۸۲ء) روس کا مشہور مصلح جس نے یورپ کی سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی (اقبال)

(دیکھئے حاشیہ صفحہ ۱۷۶)

ہیگل: (۱۷۷۰ء - ۱۸۳۱ء) جرمنی کا مشہور و معروف فلسفی جو کہتا ہے کہ تناقض یا تضاد اس کائنات کی بنیاد اور اصل حیات ہے جس پر کیونٹسٹ نظریہ سازوں نے جدیدیاتی مادہ پرستی کی بنیاد رکھی جب کہ خود ہیگل بڑا پکا مذہبی مسیحی عقیدہ رکھتا تھا۔

مزدک: زرتشتی مذہب کا مبلغ، ایران قدیم کا فلسفی (وفات ۵۳۸ء) جو زن، زر اور زمین کو فساد کی جڑ بتلاتا تھا اور ان تینوں کی منصفانہ طریقے سے تقسیم کا حامی تھا گویا اس کا فلسفہ موجودہ کیونٹسٹ تحریک کی ابتدائی شکل تھا۔

(دیکھئے حاشیہ صفحہ ۱۸۰)

لارڈ بائرن: (۱۷۷۳ء - ۱۸۲۳ء) مشہور انگریزی شاعر جس کی شاعری جذبہ بغاوت انانیت، زور کلام اور سوز و گداز سے عبارت ہے۔ اپنے ہی جگر سے کشید کرنے میں اس کی انانیت کی طرف اشارہ ہے۔

ایگر نڈر ہٹونی ہنگری کا جوانامرگ شاعر جس نے شہنشاہیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جس کی پاداش میں گھر سے نکالا گیا۔ سخت عسرت اور لاقہ کشی کی مصیبتیں جھیلیں۔ اس نے جہاں فطرت پرستی اور جوش تخیل سے معمور نظمیں لکھیں وہیں باغیانہ شاعری بھی کی اور آخر کار ۳۱ جولائی ۱۸۳۸ء کو ملوکیت کے خلاف معرکہ کارزار میں مارا گیا۔

فرانسیسی فلسفی آگسٹ کومٹ (۱۷۹۸ء - ۱۸۵۷ء) فلسفہ اثباتیت (POSITIVISM) کا بانی جو کائنات کے ظواہر سے بحث کرتا ہے اور تصویریت کی ضد ہے اس نے انسان کو انسانیت کی پرستش کی تعلیم دی۔

ہنری برگساں: (۱۸۵۹ء - ۱۹۳۱ء) مشہور فرانسیسی فلسفی جس کے نزدیک تغیر مسلسل ہی قانون حیات ہے جس میں تکرار نہیں، سائنس اور عقل حقیقت کی دسترس سے باہر ہیں صرف وجدان سے حقیقت کا ادراک ممکن ہے۔ کائنات اپنے جوش نمود

شوپن ہار و ٹٹھا	ٹٹھا	۱۷۵	-۱۲
۲ ٹٹھا		۱۸۲	
صحبت رنگاں	فالسٹائے	۱۷۶	-۱۳
صحبت رنگاں	کارل مارکس	۱۷۶	-۱۳
" (۱)	ہیگل	۱۷۷	-۱۵
(۲) جلال و ہیگل		۱۷۹	
صحبت رنگاں	مزدک	۱۷۷	-۱۶
آمن سٹائن	آمن سٹائن	۱۸۰	-۱۷
(۱) بائرن	بائرن	۱۸۱	-۱۸
(۲) شعرا			
ہٹونی	ہٹونی	۱۸۳	-۱۹
ایک مقالہ	کومٹ	۱۸۳	-۲۰
	برگساں	۱۸۰	-۲۱
(۱) پیغام برگساں		۱۸۸	
(۲) حکما			

ELAN-VITA سے ارتقا پذیر ہے جس کو اقبال نے لالے کے داغ جگر کے سوز و دام کا نام دیا ہے۔
 نین: صدر جمہوریہ اشتراکیہ روسیہ (۱۸۷۰-۱۹۲۳)۔

قیصر ولیم: فریڈرک ویلہلم جو قیصر ولیم ثانی کے نام سے جانا جاتا ہے (۱۸۵۹-۱۹۳۱-۱۹۱۳) میں دوسری جنگ عظیم اسی نے پھیری تھی۔ اقبال نے اس کو بلوکیت کے نمائندہ بہ طور ہمیش کیا ہے۔

جان لاک: (۱۶۷۸-۱۸۰۳) مشہور انگریز فلسفی جو صرف حواس خمسہ اور مشاہدات ہی کو علم کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ ذہن انسانی سادہ سمجھنے کے مانند ہے حواس اور مشاہدہ اس کے سامنے جو کچھ لاتے ہیں وہ ذہن انسانی پر نقش ہو جاتا ہے۔ "بادِ خورشید" اور "لالہ تہی جام" کے استعاروں میں اقبال نے اس کا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔

ایمانوئیل کانت: (۱۷۲۳-۱۸۰۳) مشہور جرمن فلسفی جس کے "فلسفہ عقل محض" سے مراد، لاک کے برعکس وہ تصورات ہیں جو حواس خمسہ پر مبنی نہیں بلکہ جو فطری طور پر انسان لے کر پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ انسانی فکر ذات واجب کا اثبات نہیں کر سکتی صرف اخلاقی حاسہ اور ضمیر کی آواز ہی سے یہ ممکن ہے جس کے لئے اقبال نے ستارہ جیسا جام (کو کب جام) کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

رابرٹ براوننگ: (۱۸۱۲-۱۸۸۵) مشہور انگریزی شاعر جس کی شاعری ایک واضح پیغام، امید، رجائیت سعی معہم اور جدوجہد کی علمبردار ہے اقبال نے "خضر" کو سعی معہم اور لٹکا پونے دامد کے استعارہ بہ طور استعمال کیا ہے۔

مرزا غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹) جس کے نزدیک لطف زندگی سراپا سوز و گداز ہو جانے اور ساغر حیات کو پگھلا کر پنی جانے میں ہے۔

مولانا رومی (۱۲۰۷-۱۲۷۳) اقبال کے روحانی مرشد اور رہنما جو کسی آمیزش کے بغیر اور راست تاک (یعنی ذات واجب) سے کشید کرنے کے قائل ہیں۔

۲۲-	۱۸۷	موسیو نین	موسیو نین	و
		قیصر ولیم	قیصر ولیم	

۲۳-	۱۸۸	لاک	حکما
-----	-----	-----	------

۲۵-	۱۸۸	کانت	حکما
-----	-----	------	------

۲۶-	۱۸۹	براوننگ	شعرا
-----	-----	---------	------

۲۷-	۱۸۹	غالب	شعرا
-----	-----	------	------

۲۸-	۱۸۹	رومی	شعرا
-----	-----	------	------

PAYAM-E-MASHRIQ (IQBAL)

Versified Translation

by

MUZTAR MAJAZ

Since Persian is no longer as well known in India and Pakistan as it was during Iqbal's time, a Urdu translation is most welcome-all the more when it is made by a scholar and poet of the calibre of Muztar Majaz who has all necessary equipment to take up the difficult task of presenting a versified Urdu rendition of this great work of Iqbal.

Prof. ANNEMARIE SCHIMMEL,

On

Translation of Javidnama

..... ضمیر اقبال تک پہنچنے کے لئے ماضی مجاز نے بڑی روحانی اور شعری جہد کی ہے، جس کے بغیر وہ شاید ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔
اقبال کی فارسی تخلیق کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے فارسی اور اردو کے محاورے سے واقفیت کافی نہیں، زبان سے دل تک پہنچنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ ماضی میں یہ صلاحیت موجود ہے، جس کا اندازہ ان کے ترجموں کی بے ساختگی اور روانی سے ہوتا ہے۔

ماضی اس روحانی اور شعری تہذیب سے واقف ہیں اقبال جس کے اس صدی میں سب سے بڑے وارث تھے۔ ان کے ترجمے ان بد نصیبوں کو جو اس تہذیب کی زبان سے واقف نہیں ہیں، اس کی روح تک پہنچنے میں رہنمائی کرتے ہیں.....

عالم خوند میری / ترجمہ ارمان حجاز